ایک گونگا
تین بہرے

ایک گونگا تین بہرے

عرب کی کہانیاں

مقبُول جہانگیر

فہرست

عجیب وصیّت

ایک دفعہ کا ذکر ہے، عرب کے کسی ملک پر ایک سلطان حکومت کرتا تھا۔ اس کے چار بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں۔ اُسے حکومت کرتے ہوئے بہت زمانہ گزر گیا یہاں تک کہ وہ بوڑھا ہو گیا۔ اس کے سر، داڑھی اور مونچھوں کے بال برف کی مانند سفید ہو گئے اور وہ آئے دن بیمار رہنے لگا۔ ایک مرتبہ تو ایسا بیمار ہوا کہ بچنے کہ کوئی امید نہ رہی۔ تب زندگی سے مایوس ہو کر اس نے اپنے چاروں بیٹوں کو پاس بلایا اور یوں کہنے لگا:

"پیارے بیٹو! میں اب مرنے والا ہوں، اس لیے جو کچھ میں تم سے کہوں اُسے غور سے سننا۔"

یہ سُنتے ہی چاروں بیٹوں کی غم سے بُری حالت ہو گئی اور انہوں نے رونا شروع کر دیا۔ انہیں اپنے باپ سے بڑی محبّت تھی۔ لڑکوں کو روتے دیکھ کر سلطان نے

خاموش رہنے کہ ہدایت کی اور کہا: عزیز بیٹو، جو دنیا میں آیا ہے، اسے ایک نہ ایک دن جانا بھی ہے۔ یہی قدرت کا دستور ہے۔ لہٰذا تم رونے دھونے کے بجائے میری بات غور سے سنو اور اس پر عمل کرنے کا وعدہ کرو۔"" بہت بہتر ابّا جان۔ آپ فرمایئے۔ ہم سن رہے ہیں۔" لڑکوں نے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا۔" دیکھو، جب میں دنیا سے رُخصت ہو جاؤں گا تو لوگ مجھے نہلا دھلا کر کفن پہنائیں گے اور پھر میری میّت قبرستان میں لے جا کر دفنا دیں گے۔ اس کے بعد مسلسل تین راتوں تک تم میں سے جو کوئی بھی میری قبر پر پہرا دے گا وہی میرے تاج و تخت کا حق دار ہو گا۔ تم میں سے جو لڑکا سُلطان بن جائے، اس کے لیے میرا حکم یہ ہے کہ وہ اپنی بہنوں کی اچھی طرح دیکھ بھال کرے، کسی کو تکلیف نہ پہنچائے اور جب وہ جوان ہو جائیں تو ان کی شادیاں کرے۔ لڑکیوں کی شادیاں کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ جو کوئی بھی پہلی بار تمہارے پاس آ کر کسی لڑکی سے شادی کرنے کی خواہش ظاہر کرے، اس کے ساتھ لڑکی کی شادی کر دینا۔ خواہ آنے والا کون انسان ہو یا درندہ یا آسمان پر اُڑنے والا پرندہ، وعدہ کرو کہ تم

اپنے باپ کی اس وصیّت پر سچے دل سے عمل کرو گے۔

چاروں لڑکوں نے قسم کھا کر عہد کیا کہ وہ وصیّت کو دل و جان سے پورا کرنے کی کوشش کریں گے، اگرچہ وہ سب دل ہی دل میں حیران تھے کہ اس عجیب و غریب وصیّت کا آخر مطلب کیا ہے۔ انہوں نے بہت دماغ لڑایا، لیکن کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آسکا۔

آخر انہوں نے سوچا کہ مرتے بوڑھے سلطان کے ہوش و حواس جاتے رہے تھے، اس لیے اُس نے ایسی بے معنی وصیّت کر دی ہو گی۔ لیکن انہوں نے اپنے باپ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس وصیّت پر عمل کریں گے۔ اس لیے جب سُلطان مر گیا اور وہ اُسے قبرستان میں دفن کر آئے تو پہلی رات سب سے بڑے بیٹے نے اس کی قبر پر پہرا دینے کا فیصلہ کیا۔ سورج غروب ہوتے ہی وہ باپ کی قبر پر پہنچ گیا۔

قبرستان میں بھیانک سنّاٹا تھا۔ جب اندھیرا زیادہ ہوا تو بڑی بڑی چمگادڑیں فضا میں پرواز کرنے لگیں۔ ان کی آنکھوں سے زرد رنگ کی چنگاریاں نکل رہی تھیں۔

بڑا بیٹا یہ دیکھ کر بہت خوف ذدہ ہوا اور اس کے لیے قبرستان میں ایک ایک پل کاٹنا دشوار ہو گیا۔ آدھی رات ہوتے ہی قبرستان میں سے بھیانک اور ڈراؤئی کی چیخیں بلند ہونے لگیں، جیسے بدروحیں چلّا چلّا کر رو رہی ہوں۔ یہ آوازیں ایسی ہولناک تھیں کہ بڑے بیٹے کا کلیجا اُچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس کا بدن خوف سے تھر تھر کانپنے لگا اور صبح ہونے سے پہلے ہی قبرستان سے بھاگ نکلا۔

اگلی رات دوسرا بیٹا اپنے باپ کی قبر پر پہرا دینے کے لیے گیا۔ اس نے بڑے بھائی کی زبانی سارا قصّہ سُن لیا تھا کہ کس طرح اسے بدروحوں نے ڈرایا تھا۔ وہ باپ کی قبر کے پاس مصلّیٰ بچھا کر نماز پڑھنے لگا یہاں تک کہ آدھی رات ہو گئی۔ یکایک قریب ہی سے ایک بھیانک چیخ بُلند ہوئی اور سارے قبرستان میں پھیل گئی۔ وہ دہشت سے تھرا گیا اور اُٹھ کر بے تحاشا قبرستان سے باہر بھاگا۔ خوفناک چیخیں برابر قبرستان کے دروازے تک اس کا پیچھا کرتی ہیں۔

تیسری رات تیسرا بیٹا قبرستان جانے کے لیے تیار ہوا اس کا خیال تھا کہ دونوں بڑے بھائی ڈرپوک ہیں۔ بھلا یہ آوازیں اور چیخیں کسی کا کیا بگاڑ سکتی ہیں۔ وہ بڑی

بہادری سے تمام رات سلطان کی قبر پر جاگتا رہا اور کوئی آواز سنائی نہ دی۔

وہ خوش تھا کہ شیطان روحیں اس سے ڈر کر ادھر نہیں آئیں۔ لیکن صُبح ہونے میں ابھی کچھ دیر تھی کہ اسے اپنے ارد گرد نہایت ڈراؤنی شکلیں دکھائی دینے لگیں۔ ان کے چہرے کالے تھے اور لمبے لمبے سفید دانت مُنہ سے باہر نکلے ہوئے تھے۔ ان کالی بلاؤں نے اُسے ہر طرف سے گھیرنا چاہا۔ پھر یکایک انہوں نے مکروہ آوازوں میں قہقہے لگا کر کہا:

"پکڑ لو اس نوجوان کو، اور اس کی تکّا بوٹی کر کے ہڑپ کر جاؤ۔ پکڑ لو۔۔۔ پکڑ لو۔۔۔ جانے نہ پائے۔"

تیسرے بیٹے نے یہ تماشا دیکھا تو خوف سے اس کا خون رگوں میں جمنے لگا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، سر پر پاؤں رکھ کر وہاں سے بھاگا اور محل میں جا کر ہی دم لیا۔ دیر تک وہ اپنا پھولا ہوا سانس ٹھیک کرتا رہا، اوپر تلے پانی کے کئی پیالے پیے، تب کچھ جان میں جان آئی۔

چوتھی رات سب سے چھوٹا بیٹا قبرستان جانے کے لیے تیّار ہوا۔ اس کا نام احمد تھا

اور اپنے تینوں بھائیوں سے زیادہ عقل مند، ہوشیار اور نیک تھا۔ اس نے اپنی تلوار کمر سے باندھی اور قبرستان میں جا پہنچا۔ بڑے بھائیوں نے اس کا مذاق اُڑایا اور کہا "جو کام ہم سے نہیں ہو سکا۔ وہ احمد کیا کرے گا؟ کیا یہ ہم سے زیادہ بہادُر ہے؟ دیکھ لینا ابھی خوف سے لرزتا کانپتا بھاگا چلا آئے گا۔"

رات بھر احمد باپ کی قبر پر جاگتا رہا۔ ننگی تلوار اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے سُن رکھا تھا کہ تلوار کے سامنے بڑے بڑے خبیث جن اور بھُوت بھاگتے ہیں۔ رات بھیگتی رہی۔ ستارے آہستہ آہستہ مغرب کی طرف جھُکتے رہے۔ کوئی ڈراؤنی آواز سُنائی نہ دی۔ ہر طرف گہرا سنّاٹا تھا۔ جب مشرقی افق کی جانب سے روشنی کی سُنہری لکیر نمودار ہو رہی تھی کہ یکایک اس نے قبرستان کی دیوار کے قریب ایک خوفناک دیو کو کھڑے دیکھا۔

اس کا چہرہ بڑا بھیانک تھا اور آنکھوں سے آگ کے شعلے اُٹھ رہے تھے۔ اس نے وہیں سے اپنے بازو پھیلائے۔ یہ بازُو احمد کو پکڑنے کے لیے بڑھنے شروع ہوئے اور بڑھتے بڑھتے بُہت نزدیک آ گئے۔ احمد نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ کسی

درندے کے پنجوں کی طرح مُڑے ہوئے ہیں اور ان پر لمبے لمبے نوکیلے ناخن ہیں۔ احمد نے اطمینان سے تلوار کا ہاتھ مارا۔ دیو کا ایک پنجہ کٹ کر نیچے گرا۔ پنجہ کٹتے ہی اس نے خوفناک چیخ ماری اور غائب ہو گیا۔ احمد نے اس کا کٹا ہوا پنجہ اٹھا کر اپنے کُرتے کی جیب میں رکھ لیا۔ اتنے میں صُبح ہو گئی۔ وہقبرستان سے نکل کر محل میں واپس آ گیا۔ دوسری رات وہ پھر قبرستان میں گیا اور باپ کی قبر کے پاس بیٹھ گیا۔ آج بھی تلوار اُس کے ہاتھ میں تھی۔ ساری رات اسے کوئی بد روح دکھائی نہ دی اور نہ اس نے کوئی بھیانک چیخ سُنی. لیکن صبح کے وقت اچانک ایک ڈراؤنیشکل کا جن زمین کا سینہ پھاڑ کر نکلا۔ اس کے دانت شارک مچھلی کے دانوں کی طرح لمبے اور تلوار کی مانند تیز تھے اور چہرہ ایسا خوف ناک کہ احمد کی جگہ کوئی اور ہوتا تو ڈر کے مارے وہیں اس کا دم نکل جاتا۔ احمد نے اللہ کا نام لے کر تلوار ماری اور جن کی گردن اڑادی۔ گردن کٹتے ہی وہ دھڑام سے گرا۔ احمد نے بڑھ کر اس کے دونوں کان کاٹ لیے۔ کان کٹتے ہی جن کا دھڑ آپ ہی آپ راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو گیا۔ احمد نے اس کے کٹے ہوئے کان جیب میں رکھ لیے اور

قبرستان سے نکل کر محل میں واپس آ گیا۔ سارا دن وہ آرام سے سویا رہا اور سورج غروب ہونے سے تھوڑی دیر پہلے جاگا. نہا دھو کر کھانا کھایا اور تلوار سنبھال کر قبرستان کی جانب روانہ ہوا۔ یہ تیسری اور آخری رات تھی جو اپنے باپ کی وصیّت پوری کرنے کے لیے اسے قبر کے پاس جاگ کر گُزارنی تھی۔ احمد ہر خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے تیّار تھا اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد آس پاس کا جائزہ لے لیتا تھا۔ آدھی رات تک کوئی خاص واقعہ پیش نہ آیا، لیکن جوں ہی اُس کے کان میں آدھی رات کا گجر بجنے کی آواز آئی وہ ہوشیار ہو گیا۔ یکایک اسے محسوس ہوا کہ قبرستان میں بہت سے لوگ چل پھر رہے ہیں۔ وہ ان کے سائے تو دیکھ رہا تھا مگر ان کی صورت دکھائی نہ دیتی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد آہستہ آہستہ ایسی آوازیں سنائی دینے لگیں جیسے بہت سی بلّیاں رو رہی ہوں اور کتّے غرّا رہے ہوں۔ احمد نے آوازوں اور سایوں کی طرف کوئی دھیان نہ دیا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ سب شیطانی حرکتیں اُسے ڈرا کر قبرستان سے بھگا دینے کے لیے ہو رہی ہیں۔ غرض وہ اپنی جگہ جما رہا۔

رفتہ رفتہ یہ آوازیں خوفناک چیخوں میں بدل گئیں، پھر آگ کی بنی ہوئی شکلیں قبرستان میں پھیل گئیں۔ ان کے ہاتھوں میں آگ کی تلواریں تھیں اور وہ چیختی چلّاتی احمد کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ اُن کی تعداد ہزاروں کے لگ بھگ ہو گی۔ ایک لمحے کے لیے احمد گھبرایا، لیکن پھر اُس نے قرآن پاک کی آیتیں پڑھ کر اپنے اوپر دم کیں اور تلوار تول کر آگ کے ان حرکت کرتے ہوئے بتوں کی جانب لپکا۔ اس کا لپکنا تھا کہ یہ بُت خود بخود غائب ہو گئے۔ پھر وہ ڈراؤنی آوازیں بھی تھم گئیں۔

احمد دوبارہ اپنے باپ کی قبر کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ صبح ہونے تک کوئی واقعہ پیش نہ آیا۔ ابھی سورج کی پہلی کرن نے آسمان کے مشرقی کنارے سے جھانکا ہی تھا کہ ایک بہت بڑا جِن نمودار ہوا۔ اُس کے بدن پر لمبے لمبے سیاہ بال تھے اور چہرے پر چار بڑی بڑی آنکھیں۔ اُس نے اپنا طباق سا مُنہ کھول کر احمد کو نگلنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ اُس نے پھرتی سے تلوار ماری۔ جِن کی گردن کٹ کر زمین پر گری۔ احمد نے اُس کی بڑی سی ناک کاٹ کر جیب میں رکھ لی۔ ناک کٹتے ہیں جِن

کا دھڑ آگ میں جل کر راکھ ہو گیا۔

احمد خوشی خوشی محل میں واپس آیا۔ چُوں کہ اُس نے اپنے باپ کی وصیّت پوری کر دی تھی، اس لیے اُسے شاہی لباس پہنا کر تخت پر بٹھایا گیا اور تمام درباریوں نے نذر پیش کی۔ شاعروں نے اس کی تعریف میں قصیدے پڑھے اور احمد نے سب کو اُن کی حیثیت کے مطابق انعام واکرام اور خلعت عطا کیے. اس کے بڑے بھائیوں نے بھی اُسے ملک کا سلطان مان لیا اور اطاعت قبول کی۔

احمد کو سلطان بنے کئی مہینے گزر گئے۔ پھر کئی برس بیت گئے۔ اس کے عہد میں رعایا خوش حال تھی۔ ہر طرف امن وامان کا دور دورہ تھا۔ کسی کو سلطان سے کوئی شکایت نہ تھی۔ وہ سب کے دکھ درد میں شریک تھا اور ہر ایک کے ساتھ انصاف سے پیش آتا۔ رعایا دن رات اُسے دعائیں دیتی۔

اس دوران میں سلطان احمد کی چاروں بہنیں جوان ہو چکی تھیں اور اب وہ جلد سے جلد اُن کی شادی کر دینا چاہتا تھا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ شہزادیوں کی حیثیت کے مطابق رشتے کہاں تلاش کرے! پھر اسے اپنے باپ کی عجیب وصیّت کا خیال

بھی آتا، جس نے مرتے وقت کہا تھا کہ جو کوئی بھی پہلی بار تمہارے پاس آ کر کسی لڑکی سے شادی کرنے کی خواہش ظاہر کرے، اُسی کے ساتھ اس کی شادی کر دینا خواہ آنے والا کوئی انسان ہو یا درندہ، یا آسمان پر اڑنے والا پرندہ۔

ایک دن سُلطان احمد اپنے دربار میں بیٹھا لوگوں کے مقدمے سُن رہا تھا کہ ایک خوفناک صورت کا شیر وہاں آیا۔ اسے دیکھتے ہی سب درباری اور پہرے دار ڈر کر بھاگ گئے۔ لیکن سلطان احمد اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ شیر نے اُس کے قریب آن کر دُم ہلائی، ہلکی آواز میں غرّایا اور کہنے لگا:

”سلامُ علیکم، اے سلطان احمد۔ میں تیرے پاس ایک درخواست لے کر حاضر ہوا ہوں۔ اُمّید ہے اپنے مرحوم والد کی وصیّت پر عمل کرتے ہوئے میری یہ درخواست قبول کرے گا۔“

”بیان کرو، تمہاری درخواست کیا ہے؟“ سلطان احمد نے کہا۔ ”اگر میں اس قابل ہوا تو تمہاری درخواست ضرور قبول کروں گا۔“

”میں آپ کی سب سے بڑی بہن سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ بس یہی میری

درخواست ہے۔"

"مگر یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک لڑکی کی شادی جنگل کے درندے سے کر دی جائے؟" سلطان احمد نے حیرت سے کہا "کبھی ایسا ہوا بھی ہے؟" "جناب، آپ اپنے والد کی وصیّت یاد کیجیے۔ انہوں نے آپ کو کیا ہدایت کی تھی؟" شیر نے جواب دیا۔

"بہت بہتر۔ میں اپنے باپ کی وصیّت پوری کروں گا۔" سلطان احمد نے کہا اور اُسی وقت اپنی سب سے بڑی بہن کی شادی شیر کے ساتھ کر دی۔ شیر اُسے اپنی کمر پر سوار کر کے چلا گیا۔

وقت گزرتا گیا۔ سلطان احمد کو اپنی بڑی بہن اور اس کے شوہر شیر کے بارے میں کچھ پتا نہ چلا کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہیں۔ ایک دن کیا ہوا کہ ایک بڑا سا چیتا دھاڑتا، گرجتا، دربار میں آیا اور درخواست کی کہ سلطان احمد اپنی دوسری بڑی بہن کی شادی اُس کے ساتھ کر دے۔ جب سلطان نے اعتراض کیا کہ بھلا چیتے کی شادی ایک شہزادی سے کیسے ہو سکتی ہے تو چیتے نے اس کو اُس کے باپ کی

وصیّت یاد دلائی۔ مجبور ہو کر سلطان نے اپنی دوسری بہن کی شادی چیتے سے کر دی اور وہ شہزادی کو لے کر چلا گیا۔

ابھی چیتے کو گئے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ آسمان سے ایک بہت بڑا عُقاب نیچے اُترا اور سلطان احمد سے کہنے لگا: "میں تیری تیسری بہن سے شادی کی درخواست لے کر آیا ہوں۔ اُمّید ہے تو اپنے باپ کی وصیّت پر عمل کرتے ہوئے اُس کی شادی مجھ سے کر دے گا۔"

سلطان احمد نے عقاب کی بات مان لی اور تیسری بہن کی شادی اس کے ساتھ کر دی۔ عُقاب شہزادی کو اپنے پنجوں میں دبا کر اُڑ گیا۔ چند لمحوں بعد وہ اتنا اونچا ہو گیا کہ ایک ننھّی مُنّی چڑیا کی مانند دکھائی دینے لگا۔

تیسری بہن کے رخصت ہونے کے بعد سلطان احمد نے سوچا، چوتھی بہن کی شادی شاید کسی انسان سے ہو گی۔ مناسب یہ ہے کہ کسی جانور یا درندے کے آنے سے پہلے ہی میں اپنی بہن کی شادی کسی اچھے آدمی سے کر دوں۔ اب زیادہ وقت ضائع کرنا ٹھیک نہیں۔ خدا نے چاہا تو کل ہی یہ کام سرانجام دوں گا۔

اگلے روز سُلطان دربار میں آن کر تخت پر بیٹھا ہی تھا کہ ایک دیو بیش قیمت کپڑے پہنے ہوئے نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھوں پر لمبے لمبے بال تھے لیکن انگلیوں میں نہایت قیمتی انگوٹھیاں تھیں۔

دیو نے آتے ہی سلطان احمد سے کہا کہ وہ چوتھی شہزادی سے شادی کرنے کا خواہش مند ہے اور اُسے اُمّید ہے کہ سلطان احمد انکار نہیں کرے گا کیوں کہ اُسے اپنے باپ سے کیا ہوا وعدہ پورا کرنا ہے۔ سلطان نے چوتھی بہن کی شادی دیو سے کر دی اور وہ اسے اپنے ساتھ لے کر چلا گیا۔

ان عجیب و غریب شادیوں سے پورے ملک میں رنج و غم کی لہر دوڑ گئی۔ رعایا کو چار شہزادیوں سے بڑی محبّت تھی اور کوئی شخص بھی یہ نہیں چاہتا تھا کہ ایسی خوب صورت شہزادیوں کی شادیاں شیروں، چیتوں، عقابوں اور دیووں سے کی جائیں۔ مگر لوگوں کو مرحوم سُلطان کی وصیّت کا بھی پورا پورا علم تھا اور وہ جانتے تھے کہ اس کی ہر بات حکمت اور دانائی سے خالی نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ لوگ کچھ عرصے رو دھو کر خاموش ہو رہے۔

کئی برس بیت گئے۔ شہزادیوں کی کوئی خیر خبر معلوم نہ ہوئی۔ اِدھر سُلطان احمد شہزادیوں کے رخصت ہونے کے بعد بہت رنجیدہ تھا۔ اس کی تنہائی دور کرنے کی خاطر وزیروں، امیروں نے یہ تجویز پیش کی کہ اب سلطان کو شادی کر لینی چاہیے، تاکہ شہزادیوں کے جانے سے محل کی کھوئی ہوئی رونقیں واپس آجائیں۔ سلطان نے شادی کی تجویز منظور کر لی، مگر سوال یہ تھا کہ وہ اپنے لیے ایسی بیوی کہاں تلاش کرے جو خوب صورت بھی ہو اور وفادار بھی اور جو اپنی میٹھی میٹھی باتوں سے اس کا دل بہلایا کرے۔

سُلطان کی سلطنت سے کئی سو کوس دور، پہاڑوں کی بُلند چوٹیوں پر ایک عالی شان قلعہ تھا اور اس لیے میں ایک خوب صورت شہزادی رہتی تھی۔ اس کا نام خدیجہ تھا۔ خدیجہ کے ماں باپ مر گئے تھے اور اب وہ اس قلعے میں اکیلی رہتی تھی۔ سلطنت کا کام وزیرِ اعظم کے ذمّے تھا لیکن وہ ہر کام میں شہزادی خدیجہ سے مشورہ کرتا تھا۔

شہزادی کی خواب گاہ میں اس کی مسہری کے عین سامنے والی دیوار پر ایک

سُنہری آئینہ لگا ہوا تھا۔ یہ آئینہ شہزادی کو اس کی ایک خالہ نے تحفے میں دیا تھا جو تمام ملک میں دانا عورت کے نام سے مشہور تھی۔ یہ طلسمی سُنہری آئینہ بھی اُسی نے بنایا تھا۔ ہر روز صبح سویرے جب شہزادی خدیجہ کی آنکھ کھُلتی تو وہ اس آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر کہتی:

"اے سُنہری آئینے، بتا مجھ سے شادی کون کرے گا؟" اور سُنہری آئینے میں سے ہمیشہ یہی آواز آتی "اے شہزادی، تو ایک بہادر اور خوب صورت نوجوان سُلطان کی بیوی بنے گی؟" آئینے کی یہ بات سُن کر شہزادی ٹھنڈی آہ بھر کر کہتی۔ "آہ نہ جانے اس وقت وہ سلطان کہاں ہو گا اور کیا کر رہا ہو گا۔ اور نہ معلوم کب میری اُس سے ملاقات ہو گی۔"

ایک دن جب آئینے نے حسبِ معمول یہی جواب اُسے دیا تو شہزادی نے اپنی بوڑھی دایہ کو طلب کیا۔ یہ وہ عورت تھی جس نے خدیجہ کو بچپن میں اپنا دودھ پلایا تھا اور شہزادی اس کی بڑی عزّت کرتی تھی۔ دایہ آئی تو شہزادی نے اس سے کہا:

”امّاں جان، میں اس قلعے میں اکیلی پڑے پڑے اُکتا گئی ہوں۔ تم جانتی ہو سلطنت کا سارا کاروبار وزیرِ اعظم نے سنبھال رکھا ہے۔ رعایا خوش ہے۔ اب میں چاہتی ہوں کہ اس قلعے سے نکل کر باہر کی دنیا دیکھوں۔ اس سے ایک تو میرا دل بہلے گا۔ دوسرے علم میں بھی اضافہ ہو گا۔ تمہاری کیا رائے ہے، امّاں؟“

دایہ نے خوش ہو کر کہا ”اے بیٹی، میں کیا اور میری رائے کیا۔ جیسی تمہاری مرضی۔ میں تیّار ہوں۔ بولو کہاں چلو گی؟ “

پہلے ہم مقدس شہر مکّے کی زیارت کو چلیں گے۔“ خدیجہ نے کہا، ”لیکن زیادہ لاؤ لشکر ساتھ لے جانے کی ضرورت نہیں۔ میں ایک عام عورت کے بھیس میں سفر کرنا زیادہ پسند کروں گی تاکہ لوگ میری طرف توجّہ نہ کریں۔ شہزادی بن کر باہر جاؤں گی تو بے شمارہ کنگلے اور فقیر تنگ کریں گے۔ اس کے علاوہ راستے میں ان ڈاکوؤں کا بھی تو خطرہ ہے جو بڑے بڑے قافلوں کو لوٹ لیا کرتے ہیں۔ ہم اپنے ساتھ زیادہ سے زیادہ دو نوکر لے لیں گے اور ضروری ساز و سامان، سونے کی اشرفیاں میں اپنے لباس کے اندر تہہ میں سی لوں گی تاکہ خدانخواستہ ڈاکو ہمیں

آن گھیریں تو انہیں سونے کی اشرفیوں کا پتانہ چل سکے۔“

غرض شہزادی خدیجہ اپنے قلعے سے نکل کر مکّے کے سفر پر روانہ ہو گئی۔ اسے دیکھ کر کوئی یہ نہ کہہ سکتا تھا کہ وہ کوئی شہزادی ہے اور اس کے سیدھے سادے لباس میں بہت سی سونے کی اشرفیاں سِلی ہوئی ہیں۔ اِدھر تو شہزادی کا چھوٹا سا قافلہ قلعے سے نکل کر مکّے جانے والی راہ پر آیا، اُدھر یکایک سُلطان احمد کا دربار میں بیٹھے بیٹھے جی گھبرایا۔ اس نے سوچا سیر و سیاحت کے لیے جانا چاہیے. بُہت دن ہو گئے، محل سے باہر نکلنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ چنانچہ اُس نے اپنے ایک راز دار وزیر کو ساتھ لیا اور وہ گھوڑوں پر سوار ہو کر محل سے باہر نِکلے۔ اِتّفاق سے سُلطان اور اس کا وزیر اسی راستے پر آ گئے جہاں سے شہزادی خدیجہ کا چھوٹا سا قافلے گزر رہا تھا۔

شہزادی کے نوکروں نے سُلطان کو بتایا کہ ہم مکّے کی زیارت کے لیے جا رہے ہیں۔ یہ سُن کر سُلطان بہت خوش ہوا۔ اس نے وزیر سے کہا کیوں نہ ہم بھی مکّہ مُعظّمہ کی زیارت کو چلیں اور اس قافلے میں شامل ہو جائیں۔ راستے میں سُنا ہے

ڈاکو لُٹیرے ہوتے رہتے ہیں۔ ایسا نہ ہو ان بے چاری عورتوں کو تنگ کریں۔ اگر ایسا ہوا تو ہم ان کی حفاظت تو کر سکیں گے۔

وزیر نے جواب دیا کہ یہ خیال بہت اچھا ہے۔ ہمیں ان عورتوں کی حفاظت کرنی چاہیے. غرض یہ دونوں بھی اس قافلے میں شامل ہو گئے اور اپنے آپ کو تاجر ظاہر کیا۔ انہوں نے شہزادی خدیجہ کو بتایا کہ وہ اکثر مکّے، مدینے کا سفر کرتے رہتے ہیں اور ان راستوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ شہزادی خدیجہ نے انہیں بڑی خوشی سے اپنے ساتھ سفر کرنے کی اجازت دے دی اور یوں راستہ طے ہونے لگا۔

ابھی تک سلطان احمد اور اس کا وزیر شہزادی خدیجہ کی صورت دیکھنے نہ پائے تھے، کیوں کہ اُس نے اپنا چہرہ سیاہ نقاب میں چھپا رکھا تھا، البتہ شہزادی نے سلطان احمد کو اچھی طرح دیکھا اور اسے یہ شریف نوجوان بہت اچھا لگا۔

دن رات فاصلہ طے کرتے ہوئے آخر وہ مکّہ معظّمہ پہنچ گئے۔ انہوں نے ایک سرائے میں اپنا سامان رکھا اور پھر خانہ کعبہ کی زیارت کے لیے گئے۔ وہاں بے

شمار لوگ کعبے کا طواف کر رہے تھے۔ ان سب نے بھی کعبے کی عمارت کے گرد سات چکّر لگائے۔ ان چکروں کو طواف کہتے ہیں۔ کعبے کی زیارت کے بعد یہ لوگ واپس سرائے میں آئے تو اِتّفاق سے سلطان احمد نے شہزادی خدیجہ کی ایک جھلک دیکھ لی۔ اس نے دل میں کہا، یہ چہرہ تو کسی شہزادی ہی کا ہو سکتا ہے۔ میں اِسی لڑکی سے شادی کروں گا لیکن کچھ خبر نہیں کہ وہ کون ہے اور اس کی شادی ہو چکی ہے یا نہیں۔

رات ہوئی تو اس نے وزیر سے اپنے اس خیال کا اظہار کیا۔ وزیر کہنے لگا۔ ”حضور، یہ کون سی بڑی بات ہے۔ وہ ایک عام عورت ہے۔ جب اسے پتا چلے گا کہ آپ ایک معمولی سوداگر نہیں، سلطان احمد ہیں تو وہ خوشی سے آپ کے ساتھ شادی کرنے کے لیے تیّار ہو جائے گی۔“

”بہر حال، تم اس کے بارے میں اتا پتا کرو کہ کون ہے اور اس کے کیا ارادے ہیں!“ سلطان نے کہا۔ ”میری رائے میں اُس کی بوڑھی دایہ سے سارا حال دریافت کرو اور پھر مجھے بتلاؤ کہ اس نے کیا کہا۔“

"آپ کے حکم کی تعمیل کی جائے گی، عالی جاہ۔" وزیر نے گردن جھکا کر کہا اور اگلے روز صبح سیدھا بوڑھی دایہ کے پاس پہنچا۔

"سلام امّاں جان، مزاج تو اچھے ہیں آپ کے؟ کوئی خدمت میرے لائق ہو تو بیان فرمایئے۔ میں اور میرا ساتھی ہر طرح آپ کی خدمت بجالانے کے لیے تیّار ہیں۔" وزیر نے دایہ سے کہا۔

بوڑھی دایہ نے اسے دعائیں دیں اور اپنے پاس ہی بٹھا لیا۔ پھر دونوں میں باتیں ہونے لگیں۔ آخر وزیر نے اس سے شہزادی خدیجہ کے بارے میں سب کچھ معلوم کر ہی لیا۔ پھر وہ دایہ سے اجازت لے کر سلطان احمد کے پاس آیا اور کہنے لگا:

"لیجیے حضور، مبارک ہو۔ میں نے اس خاتون کے بارے میں اس کی دائی سے سب باتیں معلوم کر لی ہیں۔ اسکا نام شہزادی خدیجہ ہے اور وہ بھی ایک سلطنت کی مالک ہے۔ اس کی خواب گاہ میں ایک سُنہری آئینہ لگا ہوا ہے، جو اس کو ہر روز یہ بتاتا ہے کہ اس کی شادی ایک سُلطان سے ہو گی۔"

”انشاء اللہ، انشاء اللہ“ سلطان احمد نے خوش ہو کر کہا۔

پھر اس نے سوچا کہ اس معاملے پر اسے خود شہزادی سے بات کرنی چاہیے۔ وہ موقع کی تلاش میں رہا مگر یہ موقع اُسے نہ مل سکا، کیوں کہ شہزادی کی حفاظت ہر وقت اس کے ملازم کرتے تھے اور بوڑھی دایہ بھی اس کے قریب ہی بیٹھی رہتی تھی۔

کچھ دنوں بعد ان کا قافلہ مکّے سے نکل کر شہر طائف کی جانب روانہ ہوا، جہاں ٹھنڈے پانی کے چشمے اور کھجوروں کے درخت تھے۔ اس کے علاوہ وہاں انگوروں کے بھی بہت سے باغ تھے۔ سارا علاقہ نہایت خُوب صورت اور سرسبز تھا۔

ابھی وہ راستے ہی میں تھے کہ ایک رات زبردست طوفان آیا۔ بجلی کی کڑک اور بادل کی گرج سے دل دہلے جاتے تھے۔ ہر طرف گھپ اندھیرا تھا۔ کبھی کبھی بجلی چمکتی تھی تو کچھ دکھائی دے جاتا تھا۔ پھر موسلا دھار بارش اور ہوا کا ایسا بے پناہ زور کہ ان کے خیموں کی طنابیں اکھڑ گئیں۔ تمام کپڑے اور سارا سامان پانی

میں بھیگ گیا۔

صحرا میں ان کے لیے پناہ لینے اور طوفان سے بچنے کی کوئی جگہ نہ تھی اور ہوا ہر لمحہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ سلطان اور وزیر کے گھوڑے بھی رسّیاں تُڑا کر بھاگ گئے اور شہزادی خدیجہ کا اونٹ اور نوکروں کی سواری کے گدھے بھی ڈر کر فرار ہو گئے۔

بوڑھی دایہ نے اس مُصیبت سے گھبرا کر دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دیا۔ شہزادی خدیجہ اُسے دلاسا دے رہی تھی کہ "امّاں جان، حوصلہ رکھو۔ خدا ہمارا نگہبان اور محافظ ہے۔ وہ ضرور مدد کرے گا؟"

"مگر بیٹی، یہ تو سوچو کہ اس بے سر و سامانی میں ہمارا کیا حشر ہو گا۔ کیا خدا آسمان سے ہماری سواری کے لیے اُونٹ گھوڑے بھیجے گا؟ اور اگر راستے میں ڈاکو آن پڑے تو پھر کیا ہو گا؟ وہ ہمیں اور ہمارے نوکروں کو لونڈیاں غلام بنا کر لے جائیں گے اور کسی کے ہاتھ بیچ ڈالیں گے۔"

یہ کہہ کر بڑھیا نے پھر آنسو بہانے شروع کر دیے۔ شہزادی خدیجہ نے اکتا کر

کہا:

"امّاں جان، میں پھر کہتی ہوں کہ گھبراؤ مت۔ خُدا کی ذات سے مایوس نہ ہونا چاہیے۔ وہ ہماری ضرور مدد کرے گا۔ سنو، میرے پاس ایک مُقدّس تعویز ہے، جو مجھے میری مرحومہ ماں نے دیا تھا۔ اس میں یہ خوبی ہے کہ ہر مصیبت میں کام آتا ہے۔"

یہ کہہ کر شہزادی نے ستارے کی شکل کا بنا ہوا کسی دھات کا ایک چمک دار ٹکڑا دایہ کو دکھایا۔ اس میں سے روشنی کی کرنیں سی پھُوٹ رہی تھیں۔

"یہ دھات کا ٹکڑا بھلا کیا کام دے گا؟" دایہ نے مُنہ بنا کر کہا۔

"ابھی تمھیں اس کا کرشمہ دکھاتی ہوں۔" شہزادی خدیجہ نے کہا اور تعویز اپنی گردن سے نکال کر دائیں ہتھیلی پر رکھا پھر مُنہ ہی میں کچھ پڑھ کر تعویذ پر پھونک ماری۔ اس کے بعد بولی: "اے حضرت سلیمان علیہ السّلام کے مقدّس تعویز۔ ہم اس وقت سخت مُصیبت میں گرفتار ہیں۔ خدا کے واسطے ہماری اس مُصیبت کو دُور کر۔"

ابھی یہ الفاظ شہزادی نے ادا کیے ہی تھے کہ ایک زور کا دھماکا ہوا اور ایک ہیبت ناک شکل کا دیو نمودار ہو کر شہزادی کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ اسے دیکھتے ہی بوڑھی دایہ نے ڈر کر چیخ ماری اور بے ہوش ہو گئی۔ یہ دیو وہی تھا جس نے سلطان احمد کی چوتھی بہن سے شادی کی تھی، لیکن شہزادی خدیجہ کو اس بارے میں کچھ پتا نہ تھا۔

"فرمایئے، میں آپ کی کیا خدمت بجالاؤں؟" دیو نے ادب سے جھک کہا۔

"ہمیں جلد کسی محفوظ مقام پر پہنچاؤ۔"شہزادی نے حکم دیا۔

"بہت بہتر۔" دیو نے کہا۔"میں آپ سب کو اپنے گھر لے چلتا ہوں۔ وہاں آپ حفاظت سے رہیں گے۔"

یکایک قافلے والوں نے محسوس کیا کہ زمین ان کے قدموں تلے سے کھسکتی جا رہی ہے اور وہ فضا میں بُلند ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ خوف سے انہوں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ ان میں سُلطان احمد اور اس کا وزیر بھی شامل تھے۔ تھوڑی دیر بعد ان کے پاؤں زمین سے لگے اور سب نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول

دیں۔

کیا دیکھتے ہیں کہ وہ ایک خوب صورت وادی میں کھڑے ہیں جس کے چاروں طرف اونچے اونچے برفانی پہاڑ ہیں۔ وادی کے درمیان میں ایک شان دار محل بنا ہوا تھا، جس کے ارد گرد نہایت حسین باغ تھا۔

وہ دیو انہیں اس محل میں لے گیا۔ اتنے میں ایک خوب صورت عورت محل میں سے نکل کر سامنے آئی اور سلطان احمد نے حیرت سے دیکھا کہ وہ اس کی چوتھی بہن تھی۔

''بھائی جان!'' وہ خوشی سے چلّائی اور سُلطان احمد کے گلے سے لپٹ گئی۔ ''ہمارے مکان میں تمہارا آنا مبارک ہو۔''

''خدا کی پناہ! تم یہاں رہتی ہو!'' سُلطان نے کہا۔ ''کیا وہ دیو جو ہمیں مُصیبت سے نکال کر لایا، تمہارا ہی شوہر ہے؟ میں نے اسے پہچانا نہیں۔''

''ہاں بھائی جان، وہ میرا شوہر ہے اور میں اس سے بہت خوش ہوں۔ مجھے اس سے

اچھاشوہر نہیں مل سکتا تھا۔"

"خُدا کا شکر ہے کہ تم اس سے خوش ہو۔ ورنہ میں تو ڈرتا تھا کہ نہ جانے یہ دیو تمہارے ساتھ کیا سلوک کرے۔ اگر ابّا جان کی وصیّت نہ ہوتی تو شاید میں تمہاری شادی کبھی اس کے ساتھ کرنے پر رضامند نہ ہوتا۔ مگر اب سوچتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ ابّا جان کی اس وصیّت میں ضرور کوئی حکمت چھُپی ہوئی ہے۔ خدا معلوم ہماری باقی تینوں بہنیں کہاں اور کس حال میں ہیں۔"

"بھائی جان، جس بہن کی شادی آپ نے جنگل کے بادشاہ شیر کے ساتھ کی تھی، وہ یہاں سے قریب ہی رہتی ہے۔ چاہو تو اس سے مل سکتے ہو۔" یہ سن کر سُلطان احمد بہت خوش ہوا۔

انہوں نے تین چار دن اس محل میں قیام کیا۔ سُلطان کی بہن اور اس کے شوہر دیو نے سب کی خاطر مدارت کی اور شہزادی خدیجہ، بوڑھی دایہ اور اس کے نوکروں کو نئے کپڑے بنا کر دیے۔ سواری کے لیے اونٹ اور گھوڑے بھی مہیّا کیے گئے۔ اس کے بعد ان سب نے مہربان دیو سے اجازت لی اور شیر کے مکان

کی جانب روانہ ہوئے، جہاں سُلطان احمد کی سب سے بڑی بہن رہتی تھی۔

ایک دن اور ایک رات سفر طے کرنے کے بعد یہ چھوٹا سا قافلہ وادی سے نکل کر ایک گھنے جنگل میں داخل ہوا۔ یہاں درختوں کی چوٹیاں آپس میں ملی ہوئی تھیں اور شاخیں اس قدر بھری بھری تھیں کہ سورج کی کرنوں کے لیے جنگل کے اندر جانے کا راستہ بند ہو گیا تھا۔ اسی لیے یہاں دن کے وقت بھی اندھیرا سا تھا۔

یکایک انہیں جنگل کے بیچوں بیچ ایک عالی شان مکان دکھائی دیا۔ اس مکان کے دروازے کے پاس شیر کا بہت بڑا بُت رکھا ہوا تھا۔ سلطان سمجھ گیا کہ یہی وہ مکان ہے جس میں بڑی بہن کا شوہر رہتا ہے۔

سُلطان نے آگے بڑھ کر دستک دی۔ تھوڑی دیر بعد مکان کے اندر سے شیر کے دھاڑنے اور گرجنے کی ہیبت ناک آواز سنائی دی۔ سب کے سب لرزنے اور کانپنے لگے، لیکن سُلطان احمد نے تسلّی دی اور کہا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور ایک لمبا چوڑا شیر کھڑا نظر آیا۔ اس کا جبڑا کھلا ہوا تھا اور نوکیلے دانت بڑے خوفناک دکھائی رہے تھے۔ شیر کو اتنے قریب پا کر وہ بوڑھی

دایہ چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی۔

"خوش آمدید، خوش آمدید! پیارے سُلطان احمد۔" شیر نے اسے پہچان لیا اور خوش ہو کر کہا۔ "آیئے، آیئے۔ بے خوف ہو کر غریب خانے میں تشریف لے آیئے۔ ارے! یہ بڑی بی شاید ڈر کر بے ہوش ہو گئی ہیں۔ انہیں بھی اندر لے آیئے۔ ابھی ہوش میں آجائیں گی۔"

یہ سن کر سب کی جان میں جان آئی اور وہ مکان کے اندر چلے گئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ہر کمرہ سجا ہوا ہے۔ بہت سے نوکر چاکر، لونڈی، غلام، کنیزیں باندیاں کاموں میں مصروف ہیں۔ مہمانوں کے آنے کی خبر سُن کر سُلطان احمد کی بڑی بہن بھی اپنے کمرے سے نکل کر آئی۔ دونوں بھائی بہن لپٹ گئے اور خوشی کے آنسو بہانے لگے۔ بڑی بہن نے بتایا کہ وہ اپنے شوہر سے بہت خوش ہے اور اسے یہاں کوئی تکلیف نہیں۔

شیر نے اصرار کر کے انہیں کئی دن اپنے مکان میں ٹھہرایا اور خاطر تواضع کی انتہا کر دی۔ طرح طرح کے کھانے مہمانوں کے لیے روز پکتے اور ہر قسم کا پھل اُن

کے سامنے رکھا جاتا۔ ایک دن سُلطان احمد نے اپنی بہن سے ذکر کیا کہ وہ شہزادی خدیجہ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ کیا اس معاملے میں تم میری مدد کر سکتی ہو؟ بہن یہ سن کر بہت خوش ہوئی، کیوں کہ وہ بھی شہزادی خدیجہ کو پسند کرنے لگی تھی۔ اس نے شہزادی کی رضامندی حاصل کی اور اس سے اگلی رات ہی بڑی دھوم دھام سے ان دونوں کی شادی ہو گئی۔ یوں اُس سُنہری طِلسمی آئینے کی پیش گوئی پوری ہوئی۔

شادی کے بعد سُلطان احمد اور اس کی بیوی خدیجہ شیر کے گھر میں ایک ماہ تک مہمان رہے۔ اس کے بعد انہوں نے جانے کی اجازت حاصل کی۔ سُلطان احمد نے شیر سے کہا:

”بھائی، تم نے جس خلوص اور محبت سے مہمان نوازی کے فرائض سر انجام دیے، میں اور میری بیوی اس کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ یہاں ہم نے اپنی زندگی کا بہترین وقت گزارا۔ کاش! میں اس قابل ہوا کہ تمہاری کوئی خدمت بجالا سکتا۔ اگر کوئی کام میرے لائق ہو تو ضرور بتاؤ۔“

”ہاں بھائی، ایک کام ایسا ضرور ہے جو تم میرے لیے کر سکتے ہو۔“ شیر نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔ ”اگر تمہیں کہیں سے کسی دیو کا کٹا ہر اپنجہ مل جائے تو لیتے آنا تا کہ میں اس کو آگ میں پھینک کر اپنی اصل انسانی صورت پر واپس آ سکوں۔“

”دیو کا کٹا ہوا پنجہ ؟“ سُلطان احمد نے حیرت سے کہا۔ ”بھائی، تم نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا۔ میری جیب میں اس وقت بھی ایک دیو کا کٹا ہر اپنجہ موجود ہے۔ اس کو میں نے اس قبرستان میں ہلاک کیا تھا جہاں میرے باپ کی قبر ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ دیو کے پنجے جادُو کا توڑ کرنے میں کام آتے ہیں۔“

یہ سنتے ہی شیر خوشی سے اُچھل پڑا۔ اس نے اُسی وقت نوکروں کو حکم دیا کہ آگ کا الاؤ روشن کیا جائے۔ آگ جلائی گئی اور دیو کا پنجہ اس میں پھینک دیا گیا۔ پنجے کا آگ میں ڈالنا تھا کہ شیر ایک دم غائب ہو گیا اور اس کی جگہ ایک حسین نوجوان سُلطان احمد کو اپنے سامنے کھڑا دکھائی دیا۔

ایک بار پھر اُس مکان میں خوشی کے شادیانے بجنے لگے اور دن رات جشن ہونے لگے۔ چند روز بعد مہمانوں نے پھر جانے کی اجازت طلب کی۔ بڑی بہن اور اس کا

شوہر اس مرتبہ مہمانوں کو جنگل کی آخری سرحد تک رخصت کرنے آئے۔ اب انہوں نے شمال کی جانب رُخ کیا۔

پانچ دن اور پانچ راتیں چلنے کے بعد وہ ایک بُہت بڑے قلعے کے دروازے پر پہنچے۔ یہ دروازہ لوہے کا بنا ہوا تھا۔ قلعے کی دیوار پر انہوں نے ایک سیاہ چیتے کی تصویر بنی ہوئی دیکھی۔ چیتے کے کالے جسم پر سفید سفید دھبّے پڑے ہوئے تھے۔ سلطان احمد نے دروازے پر دستک دی۔ ایک چوکیدار نے دروازہ کھولا اور پوچھا "کیا کام ہے؟"

"ہم مسافر ہیں۔" سُلطان احمد نے کہا "چند دن اس قلعے میں ٹھہرنے کے ارادے سے اِدھر آئے ہیں۔""" اس قلعے کا مالک اور میرا آقا ایک چیتا ہے۔ آپ لوگ یہیں رُکیے میں ابھی اپنے آقا کو اطلاع دیتا ہوں۔ وہی آپ کا استقبال کریں گے۔"

"اس قلعے کا مالک ایک چیتا ہے۔" سُلطان احمد نے اپنی بیوی شہزادی خدیجہ سے کہا۔ "ممکن ہے یہ وہی چیتا ہو جس سے میری دوسری بہن کی شادی ہوئی ہے۔"

اتنے میں سیاہ رنگ کا ایک بڑا سا چیتا دوڑتا ہوا آیا۔ سُلطان احمد نے اُسے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ یہ اُس کی دوسری بہن کا شوہر تھا۔

"آہا! بھائی تشریف لائے ہیں۔" چیتے نے خوشی سے اچھلتے ہوئے کہا۔ "میری بڑی خوش نصیبی ہے کہ آپ یہاں آئے۔ اندر چلئے اور اپنی بہن سے ملیے۔ وہ آپ کو بہت یاد کرتی ہے۔"

سلطان احمد اور اس کے ساتھی قلعے میں گئے اور وہاں کی چہل پہل دیکھ کر حیران ہوئے۔ احمد اپنی دوسری بہن سے ملا۔ اس نے احمد کو بتایا کہ وہ اپنے شوہر چیتے

کے ساتھ بڑی شان دار زندگی بسر کر رہی ہے اور اُسے یہاں کوئی تکلیف نہیں۔ تب احمد نے بڑی بہن اور اس کے شوہر شیر سے ملنے کی داستان سُنائی۔ آخر میں یہ بھی بتایا کہ کس طرح شیر اپنی اصلی انسانی صورت میں واپس آیا اور ایک خوب صورت نوجوان بن گیا۔

چیتے نے یہ کہانی سُن کر گردن ہلائی اور اُس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ احمد نے پوچھا:

”بھائی، تم کیوں روتے ہو؟ اگر میں تمہارے کسی کام آسکتا ہوں تو بتاؤ۔ شاید میں تمہارا غم دُور کر سکوں۔“

”میری سوتیلی ماں نے بچپن میں مجھ پر جادو کیا اور میں انسان سے ایک خوف ناک چیتا بن گیا۔ اب دوبارہ مجھے اصلی صورت پر لانے کی ایک ہی تدبیر ہے۔“ چیتے نے کہا۔

”کیا تدبیر ہے؟ جلدی بتاؤ۔“ احمد نے پوچھا۔

”اگر کسی جن کی کٹی ہوئی ناک نمک ملے ہوئے پانی میں ڈال دی جائے اور میں اس پانی سے نہاؤں تو اپنی اصلی شکل میں واپس آسکتا ہوں لیکن افسوس کہ جن کی کٹی ہوئی ناک حاصل کرنا محال ہے۔“

”مگر میرے لیے آسان ہے۔“ احمد نے کہا۔ ”ایک جن کی کٹی ہوئی ناک اس وقت بھی میری جیب میں موجود ہے۔“

یہ سنتے ہی چیتا خوشی سے اُچھلنے کودنے لگا۔ اسی وقت ایک بڑے سے برتن میں پانی لایا گیا۔ پہلے اس میں نمک حل کیا گیا۔ اس کے بعد سُلطان احمد نے اس میں جن کی کٹی ہوئی ناک ڈال دی۔ ناک کا پانی میں گرنا تھا کہ پانی ایک دم کھولنے لگا۔ سب لوگ دم بخود کھڑے یہ عجیب تماشا دیکھ رہے تھے۔ دیر تک ابلنے اور کھولنے کے بعد پانی آہستہ آہستہ ٹھنڈا ہونے لگا۔ ٹھنڈا ہونے کے بعد اسے چیتے کے بدن پر ڈالا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہاں سیاہ چیتے کے بجائے ایک خوب صورت نوجوان کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس نے جھپٹ کر احمد کو گلے سے لگا لیا اور دیر تک اس کا شکریہ ادا کرتا رہا۔ کئی دن تک چیتے کے آدمی بننے کی خوشی میں قلعے

کے اندر جشن منایا گیا۔

اس کے بعد سُلطان احمد اور شہزادی خدیجہ نے اپنے میزبانوں سے رُخصت ہونے کی اجازت طلب کی اور ایک بار پھر انجانی منزل کی طرف روانہ ہوئے۔ چلتے چلتے وہ پہاڑوں سے گھِری ہوئی ایک سنسان وادی میں پہنچے۔ یہاں آدم تھا نہ آدم زاد۔ ہر طرف ایک ہو کا سا عالم ایسی گہری خاموشی کہ آپ ہی آپ خوف آنے لگتا تھا۔ سُلطان احمد اور شہزادی خدیجہ نے نہایت بیش قیمت کپڑے پہن رکھے تھے۔ ان کے علاوہ شہزادی کے پاس بہت سے زیور اور ہیرے جواہر بھی تھے۔ یہ سب تحفے انہیں چیتے نے انسان بننے کی خوشی میں دیے تھے۔ ان کے نوکر بھی مالا مال ہو گئے تھے۔ نفیس گھوڑے اور قیمتی اونٹ ان تحفوں کے علاوہ تھے۔ انہوں نے اپنے جانوروں کے گلے اور ہاتھ پاؤں میں چاندی کے زیور ڈال

”جہاں پناہ، یہاں سے آپ کا ملک اب صرف ایک دن کی دوری پر ہے۔“ وزیر نے سُلطان کو بتایا۔ ”لیکن بہتر یہ ہے کہ اس سنسان وادی میں رُکنے کے بجائے ہم بڑھتے چلیں، کیوں کہ یہاں ڈاکوؤں اور لٹیروں کا بڑا خطرہ ہے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے۔“ احمد نے کہا ”مگر یہ بھی تو دیکھو کہ ہم کس قدر تھک چکے ہیں۔ تھوڑی دیر آرام کر لیں، پھر آگے بڑھیں گے۔“

ابھی یہ الفاظ سُلطان کے منہ سے نکلے ہی تھے کہ پہاڑی راستوں سے دس پندرہ گھُڑسوار ایک دم نمودار ہوئے۔ اُن کے چہرے کالی نقابوں میں چھپے ہوئے تھے اور ہاتھوں میں چمکتی ہوئی ننگی تلواریں تھیں۔ وہ سب غُل مچاتے اور تلوار ہلاتے اس تیزی سے آئے کہ سُلطان احمد اور اس کے آدمیوں کو سنبھلنے کا بالکل موقع نہ ملا، اور وہ ہکّا بکّا ان کی طرف دیکھنے لگے۔

”جو کچھ مال متاع تمہارے پاس ہے، نکال کر فوراً ہمیں دے دو۔“ ڈاکوؤں کا سردار چلّایا۔ ”ورنہ ہم تم سب کو چُن چُن کر قتل کر دیں گے۔“

یہ سُنتے ہی سُلطان احمد اور وزیر نے اپنی اپنی تلواریں نکال لیں اور ڈاکوؤں پر حملہ کر دیا۔ ڈاکوؤں کو ان دو آدمیوں سے ایسے حملے کی توقع نہ تھی۔ وہ سنبھل بھی نہ سکے اور دیکھتے دیکھتے دو ڈاکوؤں کی گردنیں کٹ کر دور جا گریں۔ اپنے ساتھیوں کو یوں قتل ہوتے دیکھ کر ڈاکوؤں کی آنکھوں میں خون اُتر آیا اور ان کے سردار

نے چیخ کر کہا:

"ساتھیو، ان مسافروں کو لوٹ کر قتل کر دو۔ ایک بھی بچ کر جانے نہ پائے۔"

مگر مسافروں کو لوٹنا اتنا آسان نہ تھا جتنا یہ ڈاکو سمجھ رہے تھے۔ شہزادی خدیجہ اور اس کے دونوں نوکروں نے بھی تلواریں نکال لی تھیں۔ البتہ بڑھیا دائی چیخ مار کر بے ہوش ہو چکی تھی۔

دونوں طرف سے تلواریں چلنے لگیں۔ شہزادی خدیجہ بڑی مہارت سے تلوار کے ہاتھ دکھا رہی تھی۔ اس نے تھوڑی دیر میں دو اور ڈاکوؤں کو خاک و خون میں ملا دیا۔ لیکن اتنے ڈاکوؤں کا مقابلہ کرنا ان چار آدمیوں اور ایک عورت کے بس کی بات نہ تھی۔

جب تلوار چلاتے چلاتے سُلطان احمد اور اس کے ساتھیوں کے بازُو شل ہو گئے اور انہیں اپنی موت سر پر منڈلاتی ہوئی دکھائی دینے لگی تو سُلطان نے دل ہی دل میں خدا سے مدد کی دُعا مانگی۔ اسی لمحے آسمان کی بُلندیوں سے بے شمار بڑے بڑے عُقاب بازو پھیلائے نیچے اُترے اور انہوں نے غضب ناک ہو کر ڈاکوؤں پر حملہ

کیا۔ ان میں ایک عُقاب سب سے بڑا تھا۔ اس نے ڈاکوؤں کے سردار پر حملہ کیا اور پنجوں سے اُس کی دونوں آنکھیں نکال دیں۔ ڈاکوؤں کا سردار خون میں نہا گیا اور اندھادھند گھوڑے کو دوڑتا ہوا بھاگ گیا۔ سردار کو بھاگتے دیکھا تو دوسرے ڈاکو بھی فرار ہو گئے۔ لیکن عُقابوں نے دُور تک اُن کا پیچھا کیا اور جب تک ان سب کی آنکھیں نہ نوچ لیں، انہیں نہ چھوڑا۔

سلطان احمد، وزیر اور شہزادی خدیجہ حیرت سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد میدان میں ڈاکوؤں کی لاشیں پڑی تھیں۔ عقاب جدھر سے آئے تھے، اُدھر ایک ایک کر کے واپس چلے گئے۔ لیکن سب سے بڑا عُقاب آہستہ آہستہ اُڑتا ہوا سُلطان احمد کی جانب آیا اور ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ اس وقت احمد نے اسے پہچانا۔ یہ وہ عُقاب تھا جس سے اس کی تیسری بہن کی شادی ہوئی تھی۔

"بھائی عُقاب، ہماری جان بچانے کا شکریہ قبول کرو۔ اگر تم وقت پر نہ پہنچتے تو یہ ظالم ہماری تکّا بوٹی کر ڈالتے۔"

"اس میں شکریے کی کیا بات ہے۔ بھائی احمد ا، یہ تو میرا فرض تھا۔ کہو، اِدھر کیسے

تشریف لائے؟“

تب سُلطان احمد نے عُقاب کو شروع سے آخر تک ساری کہانی سُنائی۔ آخر میں عُقاب نے رنجیدہ لہجے میں کہا:

”کاش میں اپنی اصلی صُورت پر واپس آ سکتا۔ لیکن یہ کام مجھے ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔“

”مجھے بتاؤ، بھائی عُقاب۔ شاید میں تمہارے کسی کام آسکوں۔“ سُلطان نے جلدی سے کہا۔

”ایک مکّار چڑیل نے مجھے جادُو کے زور سے عُقاب بنا دیا ورنہ میں بھی تُم جیسا انسان تھا۔“ عُقاب نے روتے ہوئے کہا۔ ”اب وہ صورت دوبارہ تبھی مل سکتی ہے کہ کسی جِن کے کان میرے جسم سے چھوائے جائیں۔ تب میں انسان بن سکتا ہوں۔ مگر جن کے کان حاصل کرنا بہت دشوار ہے۔“

”لیکن میرے لیے دشوار نہیں۔“ احمد نے فوراً کہا۔

”خوش ہو جاؤ بھائی عُقاب کہ تمہاری مُصیبت کے دِن کٹ گئے۔ جن کے کان میری جیب میں موجود ہیں۔ “

اس نے کان جیب سے نکال کر عُقاب کے پروں سے لگا دیے۔ پلک جھپکتے میں عُقاب ایک خوب صُورت نوجوان میں بدل گیا۔ دونوں خوشی سے لپٹ گئے۔ پھر وہ نوجوان سُلطان احمد کو اپنے گھر لے گیا جو وہیں ایک پہاڑ کی چوٹی پر بنا ہوا تھا۔ سلطان کی تیسری بہن اتنی مدّت بعد اپنے بھائی کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور جب اُسے معلوم ہوا کہ اس کا شوہر عُقاب کے روپ سے بدل کر اب انسان بن چکا ہے تو اُس کی مسرّت کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔

تین روز تک عُقاب نوجوان کے گھر میں قیام کرنے کے بعد سُلطان احمد اور اس کی بیوی شہزادی خدیجہ وہاں سے روانہ ہوئے اور اس ملک میں آئے جہاں سلطان احمد کی حکومت تھی۔ رعایا نے ان کا شاندار استقبال کیا۔ برسوں تک دونوں نے اپنے ملک پر حکمرانی کی۔ آخر وہ بوڑھے ہوئے۔ پھر اللہ نے انہیں اپنے پاس بلا لیا۔

جیسا سوال، ویسا جواب

ایک دفعہ کا ذکر ہے، ملک فارس (ایران) سے ایک بُہت عالم فاضل شخص مِصر کے دارالحکومت قاہرہ میں آیا۔ بادشاہ نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی اور پوچھا کہ آپ کے تشریف لانے کا سبب کیا ہے؟ فارس سے آنے والے عالم نے جواب دیا:

"بادشاہ سلامت، میں اپنے ملک کا وزیر ہوں اور دنیا بھر میں گھومنے پھرنے کے لیے نکلا ہوں۔ اس سیر و سیاحت کا مقصد یہ ہے کہ میں اپنے چند سوالوں کا جواب چاہتا ہوں مگر افسوس کہ جہاں بھی گیا، کوئی ان سوالوں کا جواب نہ دے سکا۔ بڑے بڑے عقل مند اور عالم فاضل ان سوالوں کا جواب دینے سے عاجز آ گئے اور انہوں نے اپنی ہار مان لی۔ میں نے سُنا تھا کہ آپ کے ملک میں کچھ ایسے عالم اور دانا لوگ ہیں جو میرے ان سوالوں کا جواب دے سکتے ہیں، اس لیے یہاں چلا

آیا۔ میں نے یہاں کی الازہر یونیورسٹی کی بھی بڑی تعریف سُنی ہے، جس میں طرح طرح کے علم پڑھائے جاتے ہیں۔ اس لیے مجھے یقین ہے کہ ان سوالوں کا جواب یہیں سے مل سکے گا۔"

"ہم یہ سُن کر بُہت خوش ہوئے۔" بادشاہ نے کہا۔ "بے شک ہمارے دربار میں اور الازہر یونیورسٹی میں ایسے بہت سے لوگ ہیں جن کے سینے علم کے سمندر سے بھرے پڑے ہیں، اور ان کی دانائی کا بھی جواب نہیں۔ ہم ابھی ان کو طلب کرتے ہیں۔ تم اپنے سوال ان کے سامنے پیش کرنا۔"

شام کے وقت بادشاہ نے اپنے ملک کے عالموں اور عاقلوں کو محل میں جمع کیا۔ جب سب آ گئے تو ان سے فارس سے آنے والے عالم کا تعارف کرایا گیا۔ اس کے بعد بادشاہ نے کہا:

"ہاں، اب تم جو سوال چاہو کرو۔"

"جہاں پناہ، میرے سوال اشاروں میں ہوں گے۔"

فارسی کے عالم نے بتایا ”اور ان لوگوں کو جواب بھی اِشاروں ہی میں دینا پڑے گا۔“

”ٹھیک ہے۔ تم اپنا سوال اشارے میں کر سکتے ہو۔“

بادشاہ نے یہ شرط مان لی۔ دربار میں تمام مصری عالم حیرت اور تعجّب کی نظروں سے فارس سے آنے والے مہمان کو دیکھ رہے تھے۔

”اب میں اپنا پہلا سوال اشارے کی صورت میں ان حضرات کے سامنے پیش کرتا ہوں۔“ مہمان نے کہا۔ ”اگر ان میں سے کسی نے اس کا جواب دے دیا، تب دوسرا سوال کروں گا۔“

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور دائیں ہاتھ کی پہلی انگلی ان عالموں کی طرف اُٹھائی۔ یہ اس کا پہلا سوال تھا۔ مِصری عالم کچھ نہ سمجھے کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ انہوں نے بُہت زور کیا، بڑا دماغ لڑایا کہ اس اشارے میں کون سا سوال چھپا ہوا ہے۔ لیکن ناکام رہے۔ آخر ایک بوڑھا شیخ اپنی جگہ سے اُٹھا اور بادشاہ کو سلام کرنے کے بعد بولا:

”حضور ہم نے معزّز مہمان کا اشارہ دیکھا۔ اس اشارے میں ضرور کوئی اہم سوال پوشیدہ ہے۔ آپ ہمیں کم از کم کچھ دن کی مہلت دیجیے تاکہ ہم غور و فکر کرنے کے بعد اس کا جواب اشارے کی صورت ہی میں دے سکیں۔ ابھی ہم اس اشارے کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ آپ حضرات کو جواب کے لیے چھ دن کی مہلت دی جاتی ہے۔“ بادشاہ نے کہا اور دربار سے اُٹھ کر چلا گیا۔ سارے شہر میں اس عجیب و غریب بات کا چرچا ہونے لگا اور لوگ اس فارسی عالم کی تعریف کرنے لگے کہ واقعی بڑا عقل مند شخص ہے، جس کا ایک ہی اشارہ ہمارے بڑے بڑے عاقل بوجھ نہیں سکتے اور انہوں نے جواب کے لیے چھ دن کی مہلت طلب کی۔ ہر شخص ایک دوسرے سے پوچھتا تھا کہ آخر آسمان کی جانب انگلی اٹھانے سے فارسی کے عالم کا مقصد کیا تھا، اور اس کا جواب کس اشارے سے دیا جائے جو صحیح ہو؟

پانچ دن گزر گئے۔ بادشاہ نے اعلان کر دیا تھا کہ اگر میرے ملک کا کوئی عقل مند اس سوال کا جواب نہ دے سکا تو میں ان سب کا مرتبہ گھٹا دوں گا اور فارس سے

آنے والے مہمان کو وزیرِ اعظم بنادوں گا۔ اس اعلان سے لوگوں میں کھلبلی مچ گئی۔ اس رات مِصری عاقلوں نے پھر اس اشارے پر غور کرنا شروع کیا، لیکن گھنٹوں سر کھپانے کے باوجود ناکام رہے۔ جب وہ اشارے کا اصل مطلب بھی نہیں سمجھ سکے تو جواب کیا دیتے؟ آخر ان میں سب سے زیادہ عُمر کا عقل مند کہنے لگا:

”دوستو! یہ معمّا ہم سے حل نہیں ہو گا۔ میرے ذہن میں ایک تدبیر آئی ہے. اگر اس پر عمل کیا جائے تو شاید ہم رُسوا ہونے سے بچ جائیں۔ بعض اوقات ایک معمولی بات بھی بڑے بڑوں کی سمجھ میں نہیں آتی، لیکن ایک بے وقوف اور جاہل آدمی فوراًاسے سمجھ لیتاہے۔ بچّے خاص طور پر ایسے عجیب اور پیچیدہ سوالوں کا جواب جلدی ڈھونڈ لیتے ہیں۔ میری رائے میں ہم کوئی ایسا بچّہ تلاش کریں جو بالکل بے وقوف ہو۔ علم اور عقل سے اسے دور کا بھی واسطہ نہ ہو۔ ممکن ہے وہ اس عجیب اشارے کا جواب اشارے ہی میں دے سکے۔“

”بہت مناسب تدبیر ہے۔ اس پر عمل کیا جائے۔“ تمام عالموں نے خوش ہو کر

کہا۔ ایسے بے وقوف بچّے کی تلاش کا کام بھی اسی بوڑھے شیخ کے سپرد کیا گیا جس
نے یہ تجویز پیش کی تھی۔

صبح مُنہ اندھے ہی بوڑھا شیخ اپنے مکان سے نکلا اور بے وقوف لڑکے کی تلاش میں
اِدھر اُدھر پھرنے لگا۔ اس کی نظر کئی کم عمر لڑکوں پر پڑی، مگر وہ اپنی چال ڈھال
سے عقل مند دکھائی دیے۔ چلتے چلتے شیخ جامعہ الازہر کے قریب جا نکلا۔ وہاں
اس نے دس بارہ برس کے ایک دیہاتی لڑکے کو دیکھا جس کے ایک ہاتھ میں کچھ
گاجریں اور دوسرے ہاتھ میں مُرغی کا ایک انڈا تھا۔ لڑکے کے چہرے پر حماقت
چھاجوں برس رہی تھی۔ شیخ نے اس لڑکے کا ہاتھ پکڑا اور کہنے لگا:

"بیٹا، تم کہاں سے آئے ہو اور تمہارا نام کیا ہے؟"

بے چارہ سیدھا سادا دیہاتی لڑکا شیخ کو دیکھ کر ایک دم ڈر گیا۔ اس نے جلدی سے
گاجریں اور انڈا اپنے کرتے کے دامن میں چھپا لیا۔ اس کا خیال تھا کہ بُڈّھا یہ
چیزیں اس سے ہتھیانے کی فکر میں ہے۔

"بولو بیٹا، تمہارا نام کیا ہے؟ گھبراؤ مت۔" شیخ نے پیار سے کہا۔ یہ میٹھے بول سن

کر لڑکے کا خوف کسی قدر دور ہوا اور اس نے جواب دیا:

”میرا نام عبد اللہ ہے اور میں اپنے گاؤں سے آیا ہوں تا کہ یہ چند گاجریں اور مرغی کا انڈا بیچ سکوں۔“

عبد اللہ کی یہ بات سُن کر شیخ کو یقین ہو گیا کہ لڑکا واقعی عقل سے پیدل ہے۔ اس کی بے وقوفی کا یہی ثبوت بُہت تھا کہ وہ قاہرہ جیسے عظیم شہر میں ایک انڈا بیچنے چلا آیا تھا۔ شیخ نے اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیر کر کہا:

”میاں عبد اللہ، تم بہت اچھے لڑکے ہو۔ اگر تم ہمارا کام کرو تو ہم نہ صرف تم سے گاجریں اور انڈا خرید لیں گے، بلکہ کچھ رقم اور بھی دیں گے۔“ ”کیا کام ہے، جناب؟“ عبد اللہ نے گھبرا کر پوچھا۔ پھر اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا جیسے بھاگنے کے لیے راستہ تلاش کر رہا ہو۔ شیخ اس کا ارادہ بھانپ گیا اور اس نے اس کا بازو سختی سے پکڑ لیا:

”آؤ عبد اللہ، میرے ساتھ چلو۔ ملک فارس سے ایک بڑا عالم فاضل آدمی یہاں آیا ہے۔ وہ اشاروں میں چند سوال کرتا ہے۔ تمہیں اشاروں ہی میں اس کے

سوالوں کا جواب دینا ہو گا۔ بہت آسان کام ہے۔ اگر تم نے اس کے سوالوں کا جواب دے دیا تو بادشاہ سلامت خوش ہو کر تمہیں بہت سی اشرفیاں اور خوب صورت کپڑے دیں گے۔"

سونے کی اشرفیاں اور خوب صورت کپڑوں کا ذکر سنتے ہی عبد اللہ کے منہ میں پانی بھر آیا۔ وہ خوشی سے اُچھلنے لگا اور بولا:

"خدا آپ کو ہمیشہ سلامت رکھے جناب۔ میں تو بُہت غریب ماں باپ کا بیٹا ہوں۔ ایک دن کچھ کھانے کو ملتا ہے تو دو دن فاقے سے کاٹنے پڑتے ہیں۔ آپ کا یہ احسان میں کبھی نہ بھولوں گا۔ میں آپ کے ساتھ چلنے کے لیے تیّار ہوں" شیخ عبد اللہ کو ساتھ لے کر اپنے مکان پر آیا، جہاں ابھی تک وہ تمام عالم اور عقل مند موجود تھے جو فارسی کے عالم کا سوال حل نہیں کر سکے تھے۔ وہ عبد اللہ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ یہ لڑکا فارسی عالم کے اشاروں کا جواب ضرور دے سکے گا۔ بس، اب دیر نہ کرو اور فوراً بادشاہ کے محل کی جانب روانہ ہو جاؤ۔

شاہی دربار میں جانے سے پہلے انھوں نے عبد اللہ کے پھٹے پرانے پھلے اُتروا کر

اسے نئے کپڑے پہنائے اور سر پر پگڑی بھی باندھی۔ عبداللہ نے اپنی گاجریں اور مُرغی کا انڈا چھوڑنا کسی قیمت پر پسند نہ کیا۔ عالموں نے اسے اجازت دے دی کہ وہ یہ چیزیں اپنے ساتھ لے جا سکتا ہے۔ لیکن بہتر یہ ہے کہ وہ انہیں اپنے کرتے کے دامن میں چھُپا لے۔ جب یہ لوگ عبداللہ کو لیے بادشاہ کے دربار میں داخل ہوئے تو وہاں ملک فارس سے آیا ہوا عالم پہلے سے موجود تھا۔ بادشاہ نے اس کی کرسی اپنے عالی شان تخت کے برابر رکھوائی تھی۔ سب عقل مندوں، عالموں نے بادشاہ کو باری باری سلام کیا اور اپنی اپنی کرسیوں پر جا بیٹھے۔ بے چارے عبداللہ کے لیے وہاں کوئی کرسی نہ تھی، اس لیے وہ ایک طرف کھڑا رہا۔

چاروں طرف سے لمبے تڑنگے حبشی غلام ننگی تلواریں ہاتھوں میں لیے چپ چاپ کھڑے تھے۔ بادشاہ کا دربار دیکھ کر عبداللہ پر خوف طاری ہو گیا تھا۔ لیکن شیخ نے اس کے کان میں کہا کہ ڈرو مت، حوصلہ رکھو۔ انشاء اللہ تم ہی جیتو گے۔

اِتنے میں بادشاہ کی نظر عبداللہ پر پڑی۔ اس نے حیرت سے کہا:

"یہ لڑکا کون ہے اور اسے دربار میں کیوں لایا گیا ہے؟"

یہ سنتے ہی بوڑھا شیخ اپنی جگہ سے اُٹھا اور کہا ”حضور یہ ایک دیہاتی اَن پڑھ لڑکا عبداللہ ہے۔ معزّز مہمان کے سوالیہ اشاروں کا جواب یہی لڑکا دے گا۔“

”اچھا!“ بادشاہ حیرت سے عبد اللہ کو تکنے لگا۔ فارس سے آنے والے عالم کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے حقارت سے عبد اللہ کی جانب دیکھا اور بادشاہ سے کہنے لگا:

”جہاں پناہ، یہ میری سخت توہین ہے کہ دس بارہ سال کا ایک ان پڑھ دیہاتی لڑکا میرے مقابلے میں لایا جائے۔ بھلا جن سوالوں کا جواب دنیا کے بڑے بڑے عقل مند لوگ نہ دے سکے، یہ لڑکا ان کا کیا جواب دے گا۔ یہ میرے ساتھ مذاق کیا گیا ہے، عالی جاہ۔“

بادشاہ نے غصّے کی نظروں سے مصری عالموں کی طرف دیکھا تو بوڑھا شیخ ہاتھ باندھ کر بولا:

”حضور، بے شک یہ لڑکا ان پڑھ اور جاہل ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے معزّز مہمان جس انداز سے سوال کرتے ہیں، ان کا جواب یہی لڑکا دے سکتا

ہے۔"

"بہت خوب! بہت خوب!" بادشاہ نے کہا۔ "خیر اب وقت ضائع نہ کیا جائے۔ اب میں اپنے معزّز مہمان سے کہوں گا کہ وہ اس لڑکے سے سوال کرے۔"

یہ حکم سُن کر فارسی کا عالم اُٹھ کر عبد اللہ کے سامنے آیا۔ عبد اللہ نے اسے دیکھ کر بندر کی طرح دانت نکال دیے۔

"حضرات میں اپنا سوال پیش کرتا ہوں۔" مہمان نے بلند آواز سے کہا۔ اور اپنے دائیں ہاتھ کی پہلی انگلی عبد اللہ کی طرف اُٹھائی۔ عبد اللہ نے جھٹ دو انگلیاں اُس کی طرف اُٹھا دیں۔ مہمان نے اپنا ہاتھ اوپر کیا۔ عبد اللہ نے فوراً اپنا ہاتھ زمین پر رکھ دیا۔ سب درباری اور بادشاہ سانس روکے، دانتوں میں انگلیاں دبائے، اس سوال جواب کا تماشا دیکھ رہے تھے۔

فارسی کے عالم نے اب اپنی بغل سے ایک تھیلا نکالا اُسے کھولا اور اس میں سے ایک مرغی نکال کر باہر پھینک دی۔ عبد اللہ نے پھُرتی سے اپنے کُرتے کے اندر ہاتھ ڈال کر انڈا نکالا اور مرغی کے قریب پھینک دیا۔

فارس کا عالم ہاتھ جوڑ کر بادشاہ کے سامنے کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا:

”جہاں پناہ، اِس ان پڑھ دیہاتی لڑکے نے میرے تینوں سوالوں کا صحیح صحیح

جواب دیا ہے اور میں بچّے کی ذہانت اور دانائی دیکھ کر بہت خوش ہوا ہوں۔ آج سے میں اس بچے کو اپنا استاد مانتا ہوں۔"

درباریوں نے خوشی کے نعروں سے آسمان سر پر اُٹھالیا۔ عبد اللہ اپنی جگہ حیران پریشان کھڑا تھا۔ بادشاہ نے اس کو اپنے پاس بُلا کر کرسی پر بٹھایا اور سر پر ہاتھ پھیرا، پھر غلاموں کو حکم دیا کہ سونے کی اشرفیوں سے بھری ہوئی تھیلیاں لائی جائیں۔ غلام اسی وقت تھیلیاں لے آئے۔ بادشاہ نے عبد اللہ سے کہا:

"یہ ساری اشرفیاں تمھیں انعام میں دی جاتی ہیں۔ تُم نے ہمارے ملک کا سر اونچا کر دیا ہے۔"

اس کے بعد سب عالموں اور عقل مندوں نے عبد اللہ کو شاباش دینے کے علاوہ اپنی اپنی طرف سے بھی انعام دیے۔ پھر بوڑھا شیخ اسے اپنے گھر لے گیا اور نوکر کو حکم دیا کہ جلد گھوڑا گاڑی تیّار کرو۔ میں عبد اللہ کو اس کے گاؤں تک چھوڑنے جاؤں گا۔ یہ سُن کر عبد اللہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ اس نے اس سے پہلے کبھی گھوڑا گاڑی میں سوار ہونے کا لُطف نہ اٹھایا تھا۔

جب وہ شیخ کے ساتھ گاڑی میں بیٹھا اپنے گاؤں کی جانب جا رہا تھا تو شیخ نے یکایک اُس سے پوچھا:

"بیٹا عبد اللہ، یہ تو بتاؤ کہ وہ تین سوال جو فارسی کے عالم نے تم سے اشاروں میں کیے تھے، کیا تھے؟ اور ان کا صحیح صحیح جواب تم نے اپنے اشاروں میں جو دیا، اس کا مطلب کیا تھا؟"

"جناب، اس کے سوال تو بہت آسان تھے۔" عبد اللہ نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "میں نے اسی وقت انہیں بوجھ لیا اور اسے ایسے جواب دیے کہ وہ بغلیں جھانکنے لگا۔ وہ میرے جوابوں کو کبھی جھٹلا ہی نہیں سکتا تھا۔"

"یہی تو میں سمجھنا چاہتا ہوں کہ اس کے سوالوں اور تمہارے جوابوں میں کیا راز چھپا ہوا تھا؟" شیخ نے کہا۔

"سنیے، جناب۔" عبد اللہ نے فخر سے سینہ پھُلاتے ہوئے کہا۔ "جب اس نے اپنے دائیں ہاتھ کی پہلی انگلی میری طرف اٹھائی اور مُنہ بنایا تو میں سمجھا، وہ یہ کہہ رہا ہے کہ اے لڑکے میں تیری آنکھ پھوڑ ڈالوں گا۔ اس کا یہ اشارہ دیکھ کر مجھے بھی تاؤ

آیا اور میں نے اسے اپنی دو اُنگلیاں دکھا کر بتایا کہ اگر تو میری ایک آنکھ پھوڑے گا تو میں تیری دونوں آنکھیں پھوڑ دوں گا۔"

"اس کے بعد اس نے اپنا ایک ہاتھ اُوپر چھت کی طرف اُٹھایا، جس کا مطلب یہ تھا کہ اگر تو میری دونوں آنکھیں پھوڑے گا تو میں تجھے چھت سے لٹکا کر پھانسی دے دوں گا۔ اس کے اس اشارے سے مجھے اور غصہ آیا اور میں نے اپنا ہاتھ زمین پر رکھ کر اُسے بتایا کہ اگر تو مجھے چھت پر لٹکائے گا تو میں تجھے زمین میں زندہ دفن کر دوں گا۔"

"تب اس نے اپنے تھیلے سے مُرغی نکال کر پھینکی اور مجھے ڈرایا کہ میں تجھے مرغی کے گوشت کی طرح کچا چبا جاؤں گا۔ میں بھلا اس سے کیوں دبتا۔ میں نے بھی جھٹ انڈا نکال کر اس کے سامنے ڈال دیا کہ میں تجھے انڈے کی طرح چٹ کر جاؤں گا۔ بس جناب، یہ جواب پاتے ہی اُس نے اپنی ہار مان لی اور میرا شاگرد بننا قبول کر لیا۔"

شیخ عبداللہ کی باتیں سن کر اتنا ہنسا، اتنا ہنسا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو

گئے۔ اس نے عبداللہ کو اس کی ہوشیاری اور عقل مندی پر بڑی شاباش دی اور اسے گاؤں تک پہنچا کر واپس آ گیا۔ اب اس نے سوچا کہ فارس کے اس عالم سے مل کر بھی پوچھنا چاہیے کہ آخر اس کے اشاروں کا اصل مطلب کیا تھا؟ فارس کا عالم بے چارہ اپنا مُنہ شرم سے چھُپائے شاہی مہمان خانے میں موجود تھا اور مِصر سے رُخصت ہونے کے لئے نوکروں کو بوریا بستر باندھنے کی ہدایت کر رہا تھا۔ الازہر یونیورسٹی کے بوڑھے اُستاد کو آتے دیکھا تو تعظیم کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔ شیخ نے اُسے سلام کیا اور مزاج پرسی کے بعد اپنے آنے کا مقصد بتایا۔

"حضرت، میں تو اُس بچّے کی بے مثال ذہانت پر اب تک عش عش کرتا ہوں۔" فارسی کے عالم نے کہا۔ "اس نے میرے تینوں سوال اچھی طرح سمجھے اور اُن کا معقول جواب دیا۔"

"مہربانی فرما کر مجھے بتائیے کہ آپ کے سوال کیا تھے اور لڑکے نے ان کا جو جواب دیا، اس کا مطلب کیا تھا؟" شیخ نے پوچھا۔

"جی ہاں، عرض کرتا ہوں۔ سنیے۔ جب میں نے اپنے دائیں ہاتھ کی پہلی انگلی

لڑکے کی طرف اُٹھائی تو میرا سوال یہ تھا کہ اللہ ایک ہے اور اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ میرا یہ اشارہ دیکھتے ہی لڑکے نے دو انگلیاں دکھایں۔ اس کا جواب یہ تھا کہ بے شک اللہ ایک ہے لیکن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بھیجے ہوئے رسول ہیں۔"

"جب میں نے اپنا ہاتھ آسمان کی طرف بلند کیا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ خُدا نے آسمان کی چھت کو ستونوں کے سہارے کے بغیر قائم کر رکھا ہے۔ لڑکے نے یہ اشارہ سمجھ کر زمین پر ہاتھ رکھ دیا اور بتایا کہ یہ زمین بھی خدا ہی نے بنائی ہے، جیسا کہ آسمان اس نے بنایا۔"

"پھر میں نے تھیلے میں سے مُرغی نکال کر پھینکی، جس کا مطلب یہ تھا کہ خدا نے مرغی پہلے پیدا کی ہے۔ لڑکے نے فوراً انڈا مرغی کے قریب پھینکا اور بتایا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ نہیں، انڈا پہلے پیدا ہوا ہے۔ اور یُوں اُس نے میرے تینوں سوالوں کے جواب صحیح صحیح دیے۔ آفرین ہے اُس دیہاتی لڑکے پہ۔ دیکھ لیجیے، کسی دن وہ وہ آپ کے ملک کا بہت بڑا آدمی بنے گا۔"

بوڑھا شیخ اپنے مکان پر واپس آیا اور بستر پر لیٹ کر دیر تک سوچتا رہا کہ یہ دنیا کتنی عجیب و غریب ہے۔ مختلف زبانوں اور مختلف عُمروں کے لوگ کس طرح ایک ہی بات کا مطلب الگ الگ سمجھتے ہیں اور انہیں پورا یقین ہوتا ہے کہ جو کچھ وہ سمجھ رہے ہیں، وہی درست ہے۔

سلیمانی انگوٹھی

ایک دفعہ کا ذکر ہے، شہر سمر قند میں ایک بہت دولت مند سوداگر رہتا تھا۔ اس کی دو بیٹیاں تھیں۔ بیوی کچھ عرصہ پہلے مر چکی تھی، اور اس نے دوسری شادی کر لی تھی۔

سوداگر کی دوسری بیوی بہت سنگ دل اور مکّار عورت تھی۔ چُوں کہ بڑی لڑکی عائشہ سے سوداگر کو بہت محبّت تھی، اس لیے وہ عائشہ کو تو کچھ نہ کہتی، لیکن چھوٹی بیٹی نُورا کو سارا دن گھر کے کام دھندوں میں لگائے رکھتی۔ سوداگر کو بھی اپنی چھوٹی بیٹی نُورا سے لگاؤ نہ تھا، کیوں کہ وہ عائشہ کے مُقابلے میں معمولی صورت شکل کی لڑکی تھی۔

جب دونوں لڑکیاں جوان ہوئیں تو سوداگر کو خیال آیا کہ اب ان کی شادی کر دینی چاہیے۔ مگر سچ پوچھو تو اسے بڑی بیٹی عائشہ ہی کی شادی کا خیال تھا۔ چھوٹی

بیٹی نُورا کے بارے میں وہ سوچتا تھا کہ بھلا اس لڑکی سے کون شادی کرے گا۔ اس نے نُورا کا رشتہ ڈھونڈنے کی بھی کوشش ہی نہیں کی۔ بڑی بیٹی عائشہ کی شادی ایک خوب صورت نوجوان سے ہو گئی اور اس کو جہیز میں سونے کی اشرفیاں، ہیرے جواہر اور چاندی کے برتن ملے۔ غرض یہ شادی سوداگر نے ایسی دھوم دھام سے کی کہ مدّتوں لوگ اس کا ذکر کرتے رہے۔

عائشہ اپنے شوہر کے ساتھ چلی گئی تو سوتیلی ماں نے نُورا پر اور ظلم ڈھانے شروع کیے۔ نُورا بڑی سیدھی سادی اور فرماں بردار لڑکی تھی۔ کبھی ایک حرف بھی زبان پر نہ لاتی اور نہ باپ سے کچھ کہتی۔ ویسے بھی سوداگر کو نُورا سے کوئی محبّت نہ تھی اور اسے کچھ خبر نہ تھی کہ سوتیلی ماں نے بچی پر کیا ظلم توڑ رکھا ہے۔

دن بھر کے کام کاج سے تھک ہار کر بے چاری نُورا جب اپنے بستر پر لیٹتی تو چپکے چپکے آنسو بہاتی اور ان اچھے دنوں کو یاد کرتی جب اس کی پیاری ماں زندہ تھی۔

ایک رات وہ اتنا روئی کہ نڈھال ہو گئی۔ رات خاصی جا چکی تھی اور نیند اس کی آنکھوں سے غائب تھی۔ وہ بستر سے اُٹھی اور اپنے مکان کے باغیچے میں گئی۔

یہاں گُلاب کی جھاڑی کے پاس اس کی پیاری ماں کبھی کبھی بیٹھا کرتی تھی، اور نُورا جب چھوٹی سی بچی تھی تو وہ گلاب کی اس جھاڑی کے سایے میں اکثر کھیلنے آیا کرتی۔ اس رات بھی وہ وہیں جا بیٹھی اور گلاب کی جھاڑی کو دیکھ دیکھ کر روتی رہی۔ اسے اپنے بچپن کے سُہانے دن ایک ایک کر کے یاد آ رہے تھے۔

”کاش! میں ایک بار پھر وہی ننھی سی بچی بن جاتی اور گلاب کی اس جھاڑی تلے کھیلا کرتی۔ مگر اب میرے پاس اِن آنسوؤں کے سوا اور کچھ نہیں۔“

”نُورا، پریشان مت ہو اور رویا نہ کرو۔ زندگی جیسی نعمت رونے کے لیے نہیں دی گئی ہے۔“ گلاب کی جھاڑی میں سے آواز آئی۔ نُورا نے حیرت سے گلاب کے پھولوں کی طرف دیکھا. اُسے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ جھاڑی نے اس کی بات سُن لی تھی اور جواب دیا تھا۔

”لیکن رونے کے سوا میں کروں بھی کیا؟“ نُورا نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”میں اپنی سوتیلی ماں کی لونڈی بن کے رہ گئی ہوں۔ کوئی نوجوان مجھ جیسی بدصورت لڑکی سے شادی کرنے کے لیے تیار نہیں ہے اور نہ ابّا جان ہی مجھ سے

محبت کرتے ہیں۔“

”مجھے سب معلوم ہے، نورا۔ لیکن اب خوش ہو جاؤ کہ تمہاری مصیبت کے دن خدا نے ختم کر دیے ہیں۔ اُسے تمہارے اوپر رحم آ گیا ہے۔ دیکھو، گلاب کی ایک کلی توڑو۔ اس کلی کے اندر تمہارے لیے ایک اچھی چیز رکھی ہے۔ اسے لے لو۔ وہ تمہارے بہت کام آئے گی۔“

نُورا نے گلاب کی جھاڑی کو غور سے دیکھا۔ اس میں چھوٹی بڑی بے شمار کلیاں لگی تھیں۔ نُورا نے ایک کلی توڑ لی، جو سب سے بڑی تھی، اور بڑے اشتیاق سے اُس کو کھولا۔ اس کے اندر سونے کی انگوٹی رکھی تھی اور اوپر طرح طرح کے نقش و نگار اور نا معلوم حُروف کھدے ہوئے تھے۔ نُورا نے خوش ہو کر یہ انگوٹھی اپنی انگلی میں پہن لی۔ وہ اس کی انگلی میں بالکل پوری آئی، جیسے اسی کے لیے بنائی گئی ہو۔ پھر اس نے گلاب کی جھاڑی کا شکریہ ادا کیا اور پوچھا کہ بند کلی میں یہ انگوٹھی کہاں سے آئی؟

جھاڑی میں سے آواز آئی۔ ”پیاری لڑکی، یہ ایک مقدس انگوٹھی ہے اور حضرت

سلیمان علیہ السّلام اپنی انگلی میں پہنا کرتے تھے۔ حضرت سلیمان کی حکومت انسانوں اور جنوں کے علاوہ ہوا اور پانی پر بھی تھی۔ اب تم اس انگوٹھی کے ذریعے اپنی تمام خواہشیں پوری کر سکتی ہو۔ جب تم اس سے کوئی کام لینا چاہو تو کہو، اے پاک انگوٹھی میں تجھ سے حضرت سلیمان کے نام پر درخواست کرتی ہوں کہ میری خواہش پوری کر۔ یہ کہتے ہی تمہاری خواہش پوری ہو جایا کرے گی۔"

"آہاجی! اب تو بڑا مزا آئے گا۔" نُورا خوشی سے اُچھلنے کودنے لگی۔ پھر اس نے انگوٹھی کی طرف دیکھ کر کہا۔ "اے پاک انگوٹھی، میں تجھ سے حضرت سلیمان کے نام پر درخواست کرتی ہوں کہ ایک خوب صورت چھوٹا سا سجا سجایا مکان مجھے مل جائے، جس میں کام کاج کے لیے ایک نوکرانی بھی ہو۔"

ابھی یہ الفاظ نُورا کے منہ سے نکلے ہی تھے کہ ہوا کا ایک زبردست جھونکا آیا اور دو اَن دیکھے ہاتھوں نے اس کو زمین سے اُٹھا کر ہوا کے کندھوں پر سوار کر دیا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ فضا میں اُڑ رہی ہے اور اندھیری رات میں آسمان پر چمکتے

دمکتے ستارے بہت روشن ہو گئے ہیں۔ اس نے نیچے دیکھا۔ اس کا شہر نہایت چھوٹا لگ رہا تھا۔ بڑے بڑے مکان بچوں کے ننھے منے گھروندوں کی مانند نظر آرہے تھے۔ نُورا نے خوف سے آنکھیں بند کرلی اور سانس روک لیا۔

تھوڑی دیر بعد اُس کے پاؤں زمین سے لگے تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ ایک سجے سجائے کمرے میں کھڑی تھی۔ چاروں طرف لمبی لمبی شمعیں جل رہی تھیں۔ کمرے میں بہترین قالین بچھا تھا۔ ایک طرف، بیٹھنے کے لیے آبنوس کی خوب صورت کرسیاں پڑی تھیں۔ الماریوں میں سونے چاندی کے برتن بھرے ہوئے تھے۔

اس کمرے سے نکل کر وہ مکان کے دوسرے کمروں میں گئی۔ ہر کمرا ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر سجا ہوا تھا۔ اتنی عمدہ چیزیں دیکھ کر اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آتا تھا اُس کا خیال تھا کہ وہ کوئی سہانا سپنا دیکھ رہی ہے۔ اتنے میں ایک نوجوان لڑکی کمرے میں داخل ہوئی اور جھک کر نُورا کو سلام کرنے کے بعد بولی:

"مالکن، لونڈی کا سلام قبول کیجیے۔ امید ہے آپ کے مزاج بخیر ہوں گے، آیئے

کھانا تیار ہے۔“

نورا ایک اور چھوٹے سے کمرے میں گئی۔ وہاں بھی خوب صورت فانوس اور شمعیں روشن تھیں۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر پردے پڑے تھے۔ ایک میز پر سونے چاندی کے برتنوں میں طرح طرح کے لذیذ کھانے رکھے ہوئے تھے۔ نُورا نے ایسے خوش ذائقہ اور نفیس کھانے اپنی زندگی میں کبھی نہیں کھائے تھے۔ خادمہ برابر اس کے سامنے ادب سے سر جھکائے کھڑی رہی۔ نُورا نے اس سے پوچھا:

”کیا تم بتا سکتی ہو، میں اس وقت کہاں ہوں؟“

”مالکن، آپ اس وقت اپنے گھر میں ہیں۔“ خادمہ نے ادب سے جواب دیا۔ ”میں آپ کی ہر خدمت کے لیے حاضر ہوں۔“

”ایسا خوب صورت مکان اور اتنا قیمتی سامان تو شاید بادشاہوں کے محلوں میں بھی نہ ہو گیا۔“ نُورا نے اپنے آپ سے کہا۔

اتنے میں خادمہ چینی کے ایک بڑے پیالے میں گرم گرم پانی لے آئی۔ نُورا نے اس پانی سے ہاتھ دھوئے تو خادمہ نے فوراً تولیہ پیش کیا۔ اس کے بعد وہ اسے ایک شان دار خواب گاہ میں لے گئی۔ وہاں بہت سے قیمتی کپڑے رکھے ہوئے تھے، ایسے کپڑے جو شہزادیاں پہنا کرتی ہیں۔ وہ ایک ایک کپڑا دیکھتی اور حیرت سے دانتوں میں انگلی دبا لیتی۔

اُس رات وہ بے فکری کی گہری نیند سوئی اور حسین حسین خواب دیکھتی رہی۔ صبح اُٹھتے ہی اُس نے انگوٹھی کی طرف دیکھا اور دوسری خواہش یوں بیان کی: ”اے حضرت سلیمان کی پاک انگوٹھی، مجھے سونے کی اشرفیوں سے بھری ہوئی ایک تھیلی چاہیے تاکہ میں دوسری عورتوں کی طرح بازار جاؤں اور اپنی پسند کی چیز خریدوں۔“

یہ الفاظ جوں ہی پورے ہوئے، سونے کی اشرفیوں سے بھری ہوئی مخمل کی ایک تھیلی نُورا کے ہاتھ میں خود بخود آگئی۔ نُورا اس وقت تک اپنے وہی میلے اور پرانے کپڑے پہنے ہوئے تھی جو اس کے سوداگر باپ نے کئی برس پہلے بنا کر دیے

تھے۔ اس نے یہ کپڑے اُتار کر نئے کپڑے اور قیمتی زیور پہنے اور خادمہ کو ساتھ لے کر بازار کی طرف روانہ ہوئی۔ اس نے اپنا چہرہ نقاب میں چھپا لیا تھا کہ کوئی اُسے پہچان نہ لے۔ اس نے اپنی سوتیلی ماں کو بھی بازار میں دیکھا۔ وہ پھل فروش کی دکان پر کھڑی پھل خرید رہی تھی۔ نُورا اس کے بالکل قریب سے گزری، لیکن وہ اسے پہچان نہیں سکی۔

نُورا کے یوں گھر سے غائب ہو جانے کا کسی کو افسوس نہ ہوا۔ بلکہ اس کی سوتیلی ماں تو دل میں بڑی خوش تھی۔ یہی حال نُورا کے باپ کا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ چلو، اچھا ہوا کہ وہ خود ہی گھر سے چلی گئی، ورنہ مجھے اس کی شادی کرنی پڑتی اور میری دولت کا کچھ حصّہ اُسے جہیز دینے میں خرچ ہوتا۔ اب میں اس خرچ سے بچ گیا۔

اِدھر اپنے خوب صورت مکان میں، وفادار خادمہ کے ساتھ، نُورا بڑے آرام سے رہ رہی تھی۔ دنیا کی تمام نعمتیں اور ہر قسم کی خوشیاں اسے میسّر تھیں۔ ہر روز وہ نِت نئے کپڑے پہنتی، ایسے لذیز کھانے اور پھل کھاتی جو بادشاہوں نے کبھی خواب میں بھی نہ کھائے ہوں گے۔ اسے سوتیلی ماں کی مار کا ڈر تھا، نہ باپ کی

جھڑکیاں اور دھمکیاں تھیں۔ جس وقت اس کا جی چاہتا اُٹھتی۔ جس وقت دل چاہتا سوتی۔ جہاں جانا ہوتا، چلی جاتی۔ کوئی روک ٹوک اور پابندی نہ تھی۔

ایک دن نُورا نے اپنی خادمہ کو کسی کام سے بازار بھیجا۔ خود وہ اپنے بستر پر لیٹی آرام کر رہی تھی۔ یکایک مکان کے دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے اُٹھ کر کھڑکی سے جھانکا۔ دروازے پر ایک نوجوان مُسافر کھڑا تھا۔

"فرمایئے جناب، آپ کو کس سے ملنا ہے؟" نُورا نے پوچھا۔

نوجوان مسافر نے نُورا کو نوکرانی سمجھ کر جواب دیا۔ "میں اجنبی ہوں۔ ایک حادثے میں میرا ہاتھ زخمی ہو گیا ہے۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ یہاں قریب ہی کسی طبیب کا مکان ہے؟"

"جی ہاں، طبیب کا مکان نزدیک ہی ہے۔" نُورا نے جواب دیا۔ "لیکن اِس وقت وہ مکان پر نہیں ملیں گے۔ آپ اندر تشریف لے آیئے۔ میں آپ کے زخم کی مرحم پٹی کر دوں گی۔"

نُورا نے جلدی سے چہرے پر نقاب ڈالا، دروازے پر گئی اور نوجوان کو لا کر کمرے میں بٹھایا۔ پھر پانی گرم کر کے اس کے ہاتھ کا زخم دھویا اور مرہم لگا کر پٹی باندھ دی۔

"میں تمہارا شکریہ کیسے ادا کروں؟" نوجوان نے کہا "تم نے مجھ مسافر کے ساتھ جو سلوک کیا ہے اسے کبھی نہ بھولوں گا اور جب کبھی سمرقند دوبارہ آؤں گا تو تمہارے لیے ایک اچھا تحفہ ضرور لے کر آؤں گا۔"

"جناب، اس میں شکریہ ادا کرنے کی کون سی بات ہے۔ یہ تو میرا فرض تھا۔" نُورا نے کہا۔ "آپ مرہم کی یہ ڈبیا اپنے ساتھ لے جائیے اور زخم پر لگاتے رہیے۔ خدا کی ذات سے اُمید ہے کہ چند ہی روز میں زخم بھر جائے گا اور ساری تکلیف جاتی رہے گی۔"

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ نُورا کی خادمہ واپس آ گئی۔ نُورا نے اسے حکم دیا کہ مسافر کے لیے فوراً قہوہ تیّار کرے۔ یہ کہہ کر وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ خادمہ نے جلدی جلدی قہوہ بنایا اور چاندی کی پیالیوں میں انڈیل کر لائی۔ مہمان

حیرت سے اِن خوب صورت برتنوں کو دیکھ رہا تھا۔ چند لمحوں بعد نُورا بھی آ گئی۔ کالی نقاب اب بھی اس کے چہرے پر پڑی ہوئی تھی۔

قہوہ پینے کے بعد نوجوان اُٹھ کھڑا ہوا۔ نُورا اُسے رُخصت کرنے کے لیے دروازے تک آئی۔ نوجوان نے ایک بار پھر اس کا شکریہ ادا کیا۔ وہ کہنے لگی:

"جناب، آپ دوبارہ سمرقند آئیں تو غریب خانے کو بھی رونق بخشیں۔ میں اس مکان میں اپنی خادمہ کے ساتھ رہتی ہوں۔"

"بہت بہتر۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ سمرقند آنا ہوا تو آپ کے مکان پر ضرور حاضر ہوں گا۔ لیکن میرا تحفہ آپ کو قبول کرنا پڑے گا۔" یہ کہہ کر مسافر نے سلام کیا اور چلا گیا۔

"مالکن، یہ نوجوان بڑا خوش اخلاق تھا۔ کسی اچھے گھرانے کا معلوم ہوتا ہے۔" خادمہ نے کہا۔

"ہاں، میرا بھی یہی خیال ہے۔" نُورا نے جواب دیا اور دیر تک اس اجنبی مسافر

کے بارے میں سوچتی رہی۔

اگلے روز وہ بازار گئی تو ایک مکّار عورت نے اس کی انگلی میں سونے کی انگوٹھی دیکھ لی۔ اس نے سوچا اس لڑکی کی انگلی سے یہ انگوٹھی اڑا لینی چاہیے۔ وہ نُورا کے پیچھے لگ گئی کہ جہاں بھی موقع ملے، انگوٹھی اس کی انگلی سے نکال لے۔

برتنوں کی ایک دکان کے پاس بڑی بھیڑ تھی۔ اس روز دُکان میں تانبے، لوہے اور پیتل کے نئے نئے برتن آئے تھے اور بہت سی عورتیں وہاں کھڑی ان برتنوں کو دیکھ رہی تھیں۔ نُورا بھی ان میں جا کھڑی ہوئی اور برتن دیکھنے لگی، حالانکہ اس کے گھر میں سونے چاندی کے برتنوں کی الماریاں بھری پڑی تھیں۔ چند لمحے بعد اس نے وہاں سے نکلنا چاہا اور عورتوں کو اِدھر اُدھر ہاتھوں سے ہٹاتی ہوئی پیچھے ہٹی۔ بس اُسے یوں لگا جیسے کسی نے پلک جھپکتے میں اس کا ہاتھ پکڑا اور چھوڑ دیا۔ اس نے اُس وقت کچھ خیال نہ کیا اور گھر واپس آ گئی۔

دوپہر کو کھانا کھانے سے پہلے جب وہ ہاتھ دھونے لگی تو اس نے دیکھا کہ سلیمان انگوٹھی غائب ہے۔ فوراً کھانا وانا چھوڑ کر مکان سے نکلی اور بازار کی طرف بھاگی۔

اُسے اس عورت کا چہرہ کچھ کچھ یاد تھا، جس نے برتنوں والی دُکان پر بھیڑ میں اس کا ہاتھ پکڑا تھا۔ لیکن اب اتنے بڑے شہر میں اسے ڈھونڈنا محال تھا۔ پھر بھی اس نے شہر کا کونا کونا چھان مارا، مگر اس عورت کا کہیں پتا نشان نہ ملا۔ بے چاری تھک ہار کر گھر واپس آگئی۔

خادمہ نے اپنی مالکہ کو یوں آنسو بہاتے دیکھا تو پوچھنے لگی، کیا ہوا؟ تب نُورا نے اُسے انگوٹی کے چرائے جانے کا قصّہ بتایا۔ خادمہ حقیقت میں ایک پری تھی۔ اس نے نُورا کو تسلّی دی:

"گھبراؤ نہیں مالکن، میں حضرت سلمان کی برکت سے اس چور کو ڈھونڈ لوں گی، جس نے تمہاری انگوٹھی چرائی ہے۔ میں ابھی اس کی تلاش میں جاتی ہوں اور انگوٹھی لے کر واپس آتی ہوں۔"

یہ کہہ کر خادمہ گھر سے چلی۔ نُورا کھڑکی کے پاس آن کر دیکھنے لگی کہ خادمہ کدھر جاتی ہے۔ اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ خادمہ مکان سے نکلتے ہی ایک خوب صورت پری بن کہ آسمان کی طرف اُڑ گئی۔

جب وہ پری سمر قند کے بڑے بازار میں پہنچی تو دوبارہ خادمہ بن چکی تھی۔ اس نے تھوڑی ہی دیر میں اُس چور عورت کو پہچان لیا۔ نُورا کی انگوٹی اُس نے اپنے مُنہ میں چھپا رکھی تھی۔ خادمہ نے ایک پنساری کی دکان سے تھوڑی سی پسی ہوئی مرچیں لیں اور چور عورت کے قریب گئی۔

وہ اس وقت ایک جوہری کی دکان پر کھڑی اس تاک میں تھی کہ جوں ہی دکان دار کی نگاہ چوکے، موتیوں کا ہار اُٹھا کر بھاگ نکلے۔ خادمہ نے سامنے پہنچ کر مرچیں اس کی ناک میں جھونک دیں۔ عورت نے زور سے چھینک ماری۔ اس کا مُنہ کھل گیا اور سونے کی انگوٹھی باہر جا گری۔ خادمہ نے انگوٹھی زمین سے اُٹھا کر اپنے قبضے میں کی، دوبارہ پری بن کر اُڑی اور نُورا کے پاس واپس آگئی۔

انگوٹھی پا کو نُورا سب رونا دھونا بھول گئی اور خادمہ کے اس کارنامے پر اِتنا خوش ہوئی کہ اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

وقت آہستہ آہستہ گزرتا گیا۔ نُورا اب تنہائی کی اِس زندگی سے اُکتا گئی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ چند سہیلیاں ہوں جن سے وہ ہنسی مذاق کی باتیں کر سکے یا کوئی

ایسا کام ہو جس میں وقت اچھی طرح کٹ جایا کرے۔ لیکن وہ اِن دونوں باتوں سے محروم تھی۔

کبھی کبھی اُسے اجنبی مسافر یاد آتا۔ نہ جانے وہ کون تھا؟ کہاں سے آیا اور اب کس جگہ ہو گا؟ کیا معلوم وہ اپنا وعدہ نبھانے کے لیے دوبارہ سمر قند آئے اور نُورا سے ملے۔ وہ اس قسم کی باتیں سوچتی سوچتی سو جاتی۔

ایک دن اچانک دروازے پر کسی نے دستک دی۔ نُورا نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ وہی اجنبی مسافر ہاتھوں میں ایک خوب صورت پنجرا اُٹھائے کھڑا تھا۔ نُورا کا دل خوشی سے جھومنے لگا۔ مگر پھر اُسے اپنے بد صورت چہرے کا خیال آیا۔ اس نے سوچا، میں یہ شکل لے کر اس کے سامنے کیسے جاؤں گی۔ یکا یک اس کی نگاہ اپنی انگوٹھی پر پڑی۔ اس نے کہا:

”اے پاک انگوٹھی، میں حضرت سلیمان کے نام پر درخواست کرتی ہوں کہ میری بد صورتی کو خوب صورتی میں بدل دے۔ میں دنیا کی سب سے حسین لڑکی بن جاؤں۔“

یہ الفاظ اس کے مُنہ سے نکلے ہی تھے کہ بادل کی گرج کی مانند ایک رعب دار آواز نُورا کے کان میں آئی:

"اے لڑکی، بہتر یہی تھا کہ جو صورت شکل تجھے خدا نے عطا فرمائی تھی، تو اس پر قناعت کرتی۔ لیکن اگر تجھے یہ شکل پسند نہیں ہے تو پھر ہم اسے بدل دیتے ہیں۔ مگر یاد رکھ! یہ میری آخری خواہش ہو گی۔ اس کے بعد یہ انگوٹھی تیری کوئی خواہش پوری نہیں کرے گی۔ کیا یہ شرط تجھے منظور ہے؟""ہاں ہاں، مجھے منظور ہے۔" نُورا چلّائی۔ "بس مجھے خوب صورت چہرہ چاہیے، جیسا شہزادیوں کا ہوتا ہے۔ اس کے بعد مجھے انگوٹھی کی ضرورت بھی نہیں رہے گی۔"

"بہت اچھا، تیری یہ خواہش پوری کی جاتی ہے۔"

اس لمحے انگوٹھی آپ ہی آپ گرم ہونے لگی، یہاں تک کہ نُورا کی انگلی جلنے لگی۔ اس نے بے تاب ہو کر انگوٹھی اُتاری اور ایک طرف پھینک دی۔ ایک دم کمرے میں گھُپ اندھیرا چھا گیا اور طرح طرح کی آوازیں آنے لگیں۔ پھر اندھیرا دُور ہو گیا۔

نُورادوڑ کر آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اس نے جو کچھ آئینے میں دیکھا، اس سے اُس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ایک بد صورت لڑکی کی جگہ انتہائی حسین چہرہ اس کے سامنے تھا۔ سُرخ و سفید، گلاب اور چنبیلی کے پھولوں کی طرح۔ جب وہ اپنی صورت دیکھ کر مسکرائی تو اس کے دانت موتیوں کے مانند چمکنے لگے۔

عین اسی لمحے وہ اجنبی مسافر خادمہ کے ساتھ کمرے میں آیا۔ جوں ہی اس کی نظر نُورا پر پڑی وہ حیرت کے ساتھ اس کی صورت تکنے لگا۔ ایسی خوب صورت لڑکی تو اُس نے کسی ملک میں بھی نے دیکھی تھی۔ ”دیکھیے، میں آپ کے لیے کتنا خوب صورت پرندہ لایا ہوں۔ یہ آپ کی تنہائی دور کرنے کے لیے بہترین ساتھی ہو گا اور روز نئے نئے گانے سنایا کرے گا۔“

اس نے پنجرا نُورا کے سامنے کر دیا۔ اس میں سُنہری رنگ کا ایک ننھا سا پرندہ پھُدک رہا تھا۔ نُورا نے جلدی سے اپنے چہرے پر نقاب ڈالا اور نوجوان سے کہا:

”مہربانی فرما کر اس کرسی پر تشریف رکھیے۔ آپ نے بڑا کرم کیا کہ غریب خانے

پر دوبارہ آئے اور اتنا خوب صورت پرندہ میرے لیے تحفے میں لائے۔“

خادمہ جلدی جلدی قہوہ تیار کر کے لائی اور نُورا نے مہمان کے لیے خود اپنے ہاتھ سے قہوہ پیالی میں انڈیا نوجوان نے گردن جھکا کر کہا:

”میں جہاں جہاں بھی گیا، آپ مجھے برابر یاد آتی رہیں۔ اگر آپ میرے زخمی ہاتھ کی مرہم پٹّی نہ کرتیں تو شاید مجھے اپنے اس ہاتھ سے محروم ہونا پڑتا۔“

”نہیں جناب، خدا نہ کرے۔“ نُورا نے کہا۔ ”جو کچھ میں نے کیا، وہ میرا فرض تھا۔ اب اسے یاد دلا کر مجھے شرمندہ نہ کیجیے۔“

”اچھا، یہ بتائیے۔ کیا آپ کسی بادشاہ کی بیٹی ہیں؟“ نوجوان نے پوچھا۔ ”آپ جیسی خوب صورت لڑکیاں ہی بادشاہوں کی بیٹیاں ہوا کرتی ہیں؟“

یہ سُن کر نُورا کا دل رنجیدہ ہو گیا. تب اس نے اپنی ساری کہانی شروع سے آخر تک نوجوان مسافر کو سنائی اور کہنے لگی۔ ”جسے آپ کسی بادشاہ کی بیٹی سمجھ رہے ہیں، وہ ایک سوداگر کی معمولی سی بیٹی ہے اور کچھ نہیں۔“

”نہیں، نہیں، آپ شہزادی ہیں۔“نوجوان نے کہا۔”اور اگر نہیں ہیں تو اب میں آپ کو شہزادی بنادوں گا۔سنیے میں ایک بہت بڑے بادشاہ کا بیٹا ہوں۔اپنے لیے ایک ایسی بیوی کی تلاش میں نکلا تھا جو خوب صورت ہونے کے ساتھ ساتھ خوش اخلاق اور مِلنسار بھی ہو۔ میں دنیا کے بہت سے ملکوں میں گیا اور کئی شہزادیاں دیکھیں لیکن ان میں سے کوئی بھی آپ جیسی نہ تھی۔اس لیے اب میں آپ سے شادی کی درخواست کرتا ہوں۔کیا آپ مجھ سے شادی کریں گی؟“

نُورا نے شرم سے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھُپا لیا۔اس کے بعد شہزادہ نُورا کو اپنے ملک میں لے گیا اور دھوم دھام سے دونوں کی شادی ہو گئی۔ سمرقند میں نُورا کا مکان اور اس کی خادمہ اُس کے رُخصت ہوتے ہی ایک رات خود بخود غائب ہو گئے اور یوں حضرت سلیمان علیہ السّلام کی مقدّس انگوٹھی نے سوداگر کی بد صورت بیٹی نُورا کی قسمت بدل دی۔
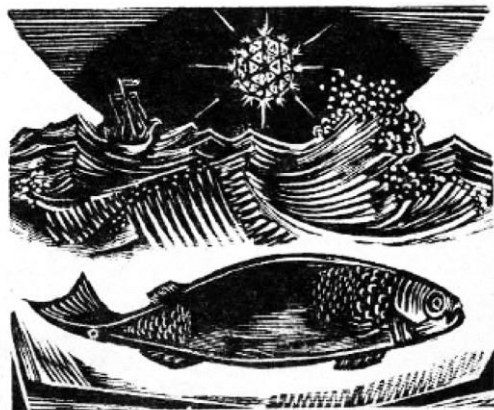
کنویں کا جِن

ایک دفعہ کا ذکر ہے، عبدُالولی نام کا ایک سوداگر عرب کے کسی شہر میں رہتا تھا۔ وہ چھوٹی موٹی تجارتی چیزیں اونٹ پر لاد کر، دور دراز کے شہروں اور قصبوں میں بیچنے کے لئے جایا کرتا تھا۔ ایسے سفر میں سے بڑے بڑے ریگستانوں اور صحراؤں سے بھی گزرنا پڑتا۔

ایک دن وہ اونٹ پر بیٹھا کسی قصبے کی طرف جا رہا تھا کہ ریگستان میں راستہ بھول کر کہیں کا کہیں جا نکلا۔ اس نے راستہ ڈھونڈنے کی بڑی کوشش کی، مگر بے سود۔ آخر اس نے اونٹ کی نکیل ڈھیلی چھوڑ دی تا کہ وہ خود راستہ تلاش کرے اور ریگستان سے نکل کر کسی آبادی میں پہنچ جائے۔ اونٹ ریگستان میں دن بھر بھٹکنے کے بعد شام کے وقت ایک چھوٹے سے نخلستان کے قریب پہنچا۔ یہاں کھجور کے دس پندرہ درختوں کے درمیان ایک بہت پرانا کنواں تھا۔ عبدُالولی اس نخلستان

اور کنویں کو دیکھ کر نہایت خوش ہوا اور اونٹ سے اُتر کر کنویں میں جھانکا۔ اس کی تہہ میں پانی نظر آرہا تھا۔

عبدُالولی نے جلدی سے اپنا ڈول اور رسّی نکالی۔ یہ دونوں چیزیں وہ ہمیشہ سفر میں اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ پہلے اس نے اونٹ کو پانی پلایا، پھر خود پیا۔ اس کے بعد تھیلے میں سے کھجوریں نکال کر کھائیں۔ اونٹ اِدھر اُدھر پڑے ہوئے کھجور کے خشک پتّے چبانے لگا۔

سورج ڈوبنے کے بعد تھوڑی دیر تو اندھیرا چھایا رہا، پھر مشرق کی جانب سے آہستہ آہستہ چودھویں کے چاند نے جھانکنا شروع کیا اور آسمان پر اِکّا دکّا روشن ستارے اُبھرنے لگے۔

"سبحان اللہ! سبحان اللہ" عبدُالولی نے خوش ہو کر جھومتے ہو کہا۔ "کیا سہانا منظر ہے۔ تعجّب ہے! اس ریگستان میں مجھے بارہا سفر کا موقع ملا لیکن یہ نخلستان اور کنواں پہلے کبھی دکھائی نہ دیا۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس جگہ کا نام کیا ہے۔"

اچانک ایک ہیبت ناک چہرہ کنویں میں سے اُبھرا اور ایک گرج دار آواز عبدُالولی

کے کان میں آئی! "اے احمق آدم زاد! مجھ سے سُن۔ یہ نخلستان اور یہ کنواں دونوں میری ملکیت ہیں، اور میں اس کنویں میں رہنے والا ایک جن ہوں۔ تجھے میری اجازت کے بغیر یہاں آنے اور کنویں میں سے پانی لینے کی جرأت کیوں کر ہوئی؟ جلدی میرے سوال کا جواب دے۔"

بے چارہ سوداگر جن کو دیکھ کر دہشت سے تھر تھر کانپنے لگا۔ دیر تک اس کے مُنہ سے آواز نہ نکلی۔

"ابے، بولتا ہے کہ نہیں؟" جن نے ڈپٹ کر کہا۔

"م۔۔۔ میں۔۔۔ میں۔۔۔ ہاتھ جوڑ کر معافی چاہتا ہوں، جناب۔۔۔" عبدُ الولی نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ "مجھے خبر نہ تھی کہ اس جگہ پر آپ کا قبضہ ہے ورنہ اِدھر کارُخ ہی نہ کرتا۔ حکم ہو تو ابھی چلا جاؤں؟"

"اب تو کہاں جا سکتا ہے، اے بے وقوف آدمی۔" جن نے طیش میں آن کر کہا۔ "تُو نے اس نخلستان کی مٹّی اور کنویں کا پانی خراب کیا ہے، اور اس جرم کی سزا صرف موت ہے۔ اب تو یہاں سے زندہ نہیں جا سکتا۔"

"رحم!۔۔۔ رحم!۔۔۔ اے طاقتور جن، مجھ غریب پر رحم کر۔ جو کچھ میرے پاس ہے، وہ مجھ سے لے لے اور میری جان چھوڑ۔"

"آہاہاہا۔۔۔!" جن نے خوف ناک قہقہہ لگایا۔ "بہت خوب!۔۔۔ بہت خوب!

مُجھے تیری یہ درخواست ماننی ہی پڑے گی۔ کیا تو وعدہ کرتا ہے کہ جب تو اپنے گھر واپس جائے گا اور تیری بیوی جو کچھ تیرے ہاتھوں میں دے گی، وہ تو مجھے دے دے گا؟" "بے شک، بے شک۔ دے دوں گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں" عبدُالولی نے فوراً کہا۔ "لیکن یہ تو بتا کہ آخر میں دوبارہ تجھ تک پہنچوں کا کیسے؟ یہ نخلستان اور کنواں نہ جانے اس ریگستان کے کس حصّے میں ہے؟"

"اس کی فکر نہ کر۔" جن نے کہا۔ "جب وہ چیز مجھے تجھ سے لینی ہو گی تو میں خود تیرے پاس پہنچ جاؤں گا۔ مجھے حضرت سلیمان علیہ السّلام کی جانب سے بڑی طاقتیں عطا کی گئی ہیں۔ دیکھ آدم زاد! اپنا وعدہ نہ بھول جانا۔ اب تو یہاں سے صحیح سلامت واپس جا سکتا ہے۔"

سورج آسمان پر خاصا فاصلہ طے کر چکا تھا۔ عبدُالولی کو رات کا واقعہ ایک خواب کی مانند یاد تھا۔ اس نے اپنے آپ سے کہا۔ "یقیناً میں نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا تھا اس نخلستان میں جن کہاں سے آ گیا۔"

اس نے جلدی سے لاحول پڑھی اور کنویں میں جا کر جھانکا۔ وہاں پانی کے سوا کچھ

بھی نہ تھا۔ اس نے کنویں سے پانی نکال کر مُنہ ہاتھ دھویا۔ اونٹ بڑی دیر سے بلبلا رہا تھا۔ اسے بھی پلایا۔ پھر کھجوروں کا ناشتا کیا اور اطمینان سے اونٹ پر سوار ہو کر ایک طرف چل دیا۔ اِتّفاق سے پچھلے روز کا کھویا ہوا راستہ بہت جلد مِل گیا۔ اس نے ایک قصبے میں اپنا سامان بیچا اور گھر کی طرف چلا۔

جوں ہی اس نے گھر کی چوکھٹ پر قدم رکھا، اس کی بیوی دوڑی ہوئی آئی اور کہنے لگی:

"ہم پر خُدا نے بڑی رحمت نازل کی۔ ذرا دیکھو تو تمہاری غیر حاضری میں یہ کون آیا ہے۔" یہ کہتے ہی بیوی نے عبدُالولی کی گود میں ایک ننھا سا بچّہ دے دیا۔ "یہ ہے تمہارا بیٹا آخر خدا نے ہماری دعائیں سُن ہی لیں۔"

"ارے! یہ کیا غضب کر دیا تم نے!" ولی نے چلّا کر کہا

"کیوں؟ کیا ہوا؟" بیوی نے گھبرا کر پوچھا۔

تب اس نے بیوی کو ساری داستان سنائی اور بتایا کہ میں تو کنویں والے جن سے

وعدہ کر چکا ہوں کہ گھر میں داخل ہوتے ہی بیوی جو کچھ میرے بازوؤں میں دے گی، وہ میں اُس جِن کے حوالے کر دوں گا۔ اس کا یہ خیال غلط ہو گیا کہ اس نے کوئی خواب دیکھا تھا۔ وہ خواب نہیں، ایک سچّا واقعہ تھا۔

"تم بھی نرے وہمی ہو۔" بیوی نے چڑ کر کہا۔ "بھلا جنّات بھی انسانوں سے کہیں ایسے وعدے کیا کرتے ہیں؟ کہیں تم سے بھنگ تو نہیں پی لی؟" "ارے نہیں۔ لا حول ولا قوۃ۔" عبدُ الولی نے کہا اور قسم کھائی کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے، بالکل صحیح ہے۔

یہ سن کر بیوی کو بھی فکر ہوئی، لیکن اس نے شوہر کو تسلّی دیتے ہوئے کہا۔ "گھبراؤ نہیں۔ میرے پاس ایک تعویذ ہے۔ وہ میں ابھی بچّے کی گردن میں ڈالے دیتی ہوں۔ اس کی برکت سے وہ خبیث جِّن بچّے کے نزدیک بھی نہیں پھٹک سکے گا۔"

انہوں نے اسی وقت بچّے کے گلے میں ایک چھوٹا سا تعویز ڈال دیا۔ دن گزرنے لگے۔ بچہ روز بروز بڑا ہوتا گیا، یہاں تک کہ دس سال بیت گئے۔ اس لڑکے کا نام

ماں باپ نے رمضان رکھا تھا، کیوں کہ وہ رمضان کے مہینے میں پیدا ہوا تھا۔ ایک دن وہ گلی میں کھیل رہا تھا کہ کنویں کا جن نمودار ہوا اور بولا:

"رمضان! اِدھر آؤ، اور میرے ساتھ چل کر نخلستان میں رہو. تمہارے باپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ تمھیں میرے حوالے کر دے گا۔"

جن کی خوف ناک صورت دیکھتے ہی دوسرے بچّے ڈر کر بھاگ گئے لیکن رمضان کھڑا رہا۔ اس نے جواب دیا: نہیں۔۔۔ میں اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا۔" یہ کہہ کر وہ اپنے گھر کی جانب دوڑا۔ جِن نے لپک کر اس کو پکڑنا چاہا لیکن تعویز کی وجہ سے جِن کا ہاتھ اس تک نہ پہنچ سکا۔ آخر وہ غصّے سے دانت نکالتا ہوا اور بھیڑیے کی طرح غرّاتا ہوا چلا گیا۔

رمضان ہانپتا کانپتا گھر پہنچا اور ماں باپ کو جِن کے آنے اور ساتھ لے جانے کی ساری کہانی سُنائی۔ وہ فوراً اس کو ایک بوڑھے فقیر کے پاس لے گئے۔ اس نے رمضان کی زبانی سارا قصّہ سُن کر کہا:

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ اس تعویز کی برکت سے وہ شریر جِن رمضان کو

اُٹھالے جانے میں کام یاب نہیں ہو گا۔ جب تک یہ تعویز اس کی گردن میں پڑا رہے گا، کوئی جِن اس کے قریب نہیں پھٹک سکتا۔ لیکن اگر یہ تعویز کھویا گیا یا اس کی گردن سے کسی نے اُتار لیا تو جِن سے اُٹھا کے لے جائے گا۔"

رمضان کے ماں باپ نے اُسے اچھی طرح سمجھا دیا کہ "خبردار! یہ تعویز کبھی گردن سے نہ اُتارنا۔ ہمیشہ اسے پہنے رہنا۔" رمضان نے وعدہ کیا کہ وہ ایسا ہی کرے گا۔

پھر کئی برس گزر گئے۔ آہستہ آہستہ عبدُالولی اور اُس کی بیوی جِن اور تعویز کے بارے میں سب کچھ بھول گئے۔ رمضان اب سترہ برس کا ایک خوب صورت اور صحت مند نوجوان تھا۔ وہ بادشاہ کی فوج میں بھرتی ہو گیا اور لڑائیوں میں حصّہ لینے کے لیے جانے لگا۔

ایک دفعہ وہ فوج کے ساتھ کسی جنگ پر گیا۔ سارا دن لڑائی ہوتی رہی۔ اس نے بڑی بہادری سے دُشمن کا مُقابلہ کیا اور بہت سوں کو موت کا مزا چکھایا۔ جب رات ہوئی تو جنگ بند ہو گئی اور دونوں طرف کی فوجیں اپنے اپنے خیموں میں

آرام کرنے کے لیے واپس آ گئیں۔

آدھی رات کو دُشمن کے سپاہیوں نے ایک دم ہلا بول دیا۔ دو سپاہی رمضان کے خیمے میں بھی گھس آئے۔ رمضان نے جلدی سے تلوار اُٹھائی اور اُن کا مُقابلہ کرنے لگا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد دُشمن کے چند سپاسی اور آ گئے۔ اب اکیلا رمضان ایک طرف اور پانچ چھ دُشمن دوسری طرف۔ سب کے ساتھ لڑنا اس کے لیے دُشوار تھا۔ قریب تھا کہ وہ اُن کے ہاتھ سے مارا جائے کہ اچانک زور دار دھماکا ہوا اور ایک ہیبت ناک جِن دُشمن کے سپاہیوں پر ٹوٹ پڑا۔ جِن کو دیکھتے ہی سپاہی تتّر بتّر ہو گئے اور یوں رمضان کی جان بچی۔ "میں تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں۔" رمضان نے جِن سے کہا "اگر اس وقت تم نہ آتے تو میں مارا گیا تھا۔ لیکن یہ تو بتاؤ کہ تم نے آخر میری جان کیوں بچائی۔"

"ہا ہا ہا ہا۔۔۔۔" جِن نے قہقہہ لگایا۔ "یاد کرو، ایک دفعہ جب تم چھوٹے سے لڑکے تھے، میں تمہیں لینے کے لیے آیا تھا۔ تمہارے باپ نے سترہ برس پہلے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ تمہیں مجھے دے دے گا۔ لیکن اس نے اپنا وعدہ پورا

نہیں کیا، اور تمہارے گلے میں تعویز ڈال دیا۔ خیر کبھی تو مجھے موقع ملے گا اور میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ میں نے تمہاری جان بھی اسی لیے بچائی کہ میں تمہارا مالک ہوں۔ اب یہ تعویز اپنی گردن سے اُتارو اور ابھی میرے ہمراہ چلو۔ دنیا بھر کی نعمتیں میں تمہیں دوں گا۔ اچھے اچھے کھانے، بہترین کپڑے اور کوہ قاف کی سیر، جہاں حسین پریاں ہیں، بڑے بڑے دیو ہیں اور بے شمار طلسمی چیزیں ہیں، جنہیں دیکھ کر تم خوش ہو گے۔ اگر تم نے میرے حکم کی تعمیل نہ کی تو یاد رکھو، میں بہت سخت انتقام لُوں گا۔ تمہیں اور تمہارے بار ماں باپ کو بھی مار ڈالوں گا۔"

ابھی جن کی تقریر جاری تھی کہ آسمان پر روشنی سی چمکی اور اس روشنی میں ایک سُنہری تخت اُتر کر زمین پر آیا۔ چار دیو اس تخت کو کندھوں پر اُٹھائے ہوئے تھے۔ تخت پر نورانی صورت کے ایک بزرگ بیٹھے تھے جن کے دائیں بائیں کئی پریاں ادب سے ہاتھ باندھے کھڑی تھیں۔ یہ بزرگ حضرت سلیمان علیہ السّلام تھے۔ جن انہیں دیکھتے ہی خوف سے تھر تھر کانپنے لگا۔ حضرت سلیمان نے

رعب دار آواز میں کہا:

"او شریر جِن! تو اِس نوجوان کو کیا دھمکیاں دے رہا تھا، کیا تُجھے ابھی تک ہوش نہیں آیا؟"

"میں معافی چاہتا ہوں، میرے آقا۔" جِن نے گڑگڑا کر کہا۔ "آیندہ ایسی غلطی نہ ہو گی۔"

"ہم نے تجھے ایسی ہی شرارتوں کی وجہ سے اُس کنویں میں قید کیا تھا۔" حضرت سلیمان نے کہا "اور ابھی تیری سزا کی مدّت پوری ہونے میں بہت دیر ہے، لیکن چُوں کہ تُو نے اس نوجوان کی جان بچائی ہے، اس لیے ہم تیری باقی سزا معاف کرتے ہیں۔ اب تجھے آزاد کیا جاتا ہے مگر خدارا آیندہ اس نوجوان اور اس کے باپ کو کبھی مت ستائیو، ورنہ عبرت ناک سزا ملے گی۔"

اس کے بعد حضرت سلیمان نے رمضان سے کہا۔ "اے "نوجوان، اب تو بالکل بے خوف ہو کر اپنے گھر جا اور اس جِن کا ڈر اپنے دل سے نکال دے۔"

چند لمحوں بعد حضرت سلیمان کا تخت دوبارہ آسمان کی جانب بلند ہوا اور دیکھتے دیکھتے نظروں سے غائب ہو گیا۔ اس کے بعد وہ جِن انہیں پریشان کرنے کے لیے کبھی نہ آیا۔

شہزادی اور چوہا

ایک دفعہ کا ذکر ہے، کسی ملک پر ایک بادشاہ کی حکومت تھی۔ اس کی ایک چھوٹی سی بیٹی تھی، جس کا نام سیفیہ تھا۔ سیفیہ سے اس کے ماں باپ بہت محبّت کرتے اور ایک لمحے کے لیے بھی اُسے اپنی آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دیتے تھے۔ بادشاہ اور ملکہ کو سیفیہ سے زیادہ دنیا میں کوئی پیارا نہ تھا۔

ایک دن بادشاہ اپنے محل میں آرام کر دیا تھا کہ چوب دار نے آن کر اِطّلاع دی کہ ایک آدمی حاضر ہونا چاہتا ہے۔ شاید کوئی مصیبت زدہ ہے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کو فوراً پیش کیا جائے۔ تھوڑی دیر بعد ایک بوڑھا بادشاہ کے سامنے پیش ہوا۔

"تم کون ہو، اور کیا چاہتے ہو؟" بادشاہ نے اُس سے پوچھا۔

بوڑھے نے روتے ہوئے کہا "جہاں پناہ، میں ایک عالم ہوں۔ مجھے اپنے چند

دشمنوں سے خطرہ ہے۔ میں ایک بہت عمدہ کتاب لکھنا چاہتا ہوں جس سے انسانوں کو بڑا فائدہ پہنچے گا، لیکن دُشمنوں نے دھمکی دی ہے کہ اگر تم نے ایسی کتاب لکھی تو تمھیں جان سے مار دیا جائے گا۔ بڑی مشکل سے جان بچا کر یہاں آیا ہوں۔ جہاں پناہ۔"

بادشاہ بوڑھے کی یہ بات سُن کر بڑا حیران ہوا۔ اس نے پوچھا "وہ لوگ کون ہیں جو تمہاری جان کے دُشمن ہوئے ہیں؟ ہم ابھی اپنے سپاہیوں کو بھیجتے ہیں وہ انہیں گرفتار کر کے لے آئیں گے۔ پھر ہم انھیں عبرت ناک سزا دیں گے۔"

"نہیں حضور، انہیں اُن کے حال پر رہنے دیجیے۔ بے شک وہ میرے دُشمن ہیں، لیکن میں تو اُن کا دشمن نہیں ہوں۔" بوڑھے نے کہا۔ "مجھے تو بس ایک چھوٹا سا کمرا اپنے محل میں رہنے کے لیے دے دیجیے تاکہ میں جلد سے جلد اپنی وہ کتاب لکھوں۔"

بادشاہ بوڑھے کی یہ بات سُن کر بڑا خوش ہوا اور اُسی وقت غُلاموں کو طلب کر کے حکم دیا کہ بوڑھے عالم کو ایک نہایت عمدہ، سجا سجایا کمرا محل میں رہنے کو دیا

جائے۔ دونوں وقت اُسے شاہی باورچی خانے سے کھانا کھلایا جائے اور اچھّے سے اچھے کپڑے پہننے کو دیے جائیں۔ اس کے علاوہ ضرورت کی جو چیز یہ مانگے فوراً مہیا کی جائے۔

بوڑھے نے بادشاہ کو فرشی سلام کیا اور غُلاموں کے ساتھ رُخصت ہو گیا۔ اُسے بادشاہ کے حکم کے مطابق محل میں ایک سجا ہوا کمرا دے دیا گیا۔

اب سُنیے کہ بوڑھا کون تھا۔ اصل میں وہ ایک جادُو گر تھا اور اِس ارادے سے آیا تھا کہ بادشاہ کے تخت پر قبضہ کرے۔ ہفتے کے چھ دن وہ کمرے میں بند ہو کر بیٹھا رہتا۔ محل کے نوکر چاکر یہی سمجھتے کہ وہ کتاب لکھنے میں مصروف ہے۔ مگر حقیقت میں وہ جادُو کا عمل کیا کرتا تھا۔ جمعے کے روز وہ بادشاہ کو سلام کرنے دربار میں جاتا۔ بادشاہ اُس سے پوچھتا:

"کیوں بڑے میاں، تمھیں کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟ کتاب لکھ رہے ہو نا؟"

بوڑھا بادشاہ کو سینکڑوں، ہزاروں دُعائیں دیتا اور پھر سلام کر کے اپنے کمرے میں واپس آ جاتا۔

ایک دن جادُوگر نے بڑھیا کا بھیس بدلا اور گھومتا پھرتا شاہی محل کے باغ میں پہنچا۔ وہاں اُس نے شہزادی سیفیہ کو دیکھا جو درختوں کے نیچے مزے سے جھُولا جھُول رہی تھی۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر جادُوگر شہزادی کے نزدیک پہنچ گیا۔ پھر اس نے جلدی سے سیفیہ کے اُوپر ایک کالی چادر ڈال کر گٹھڑی سی بنائی اور اُسے کندھے پر ڈال کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ ننھی شہزادی خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی، کیوں کہ اُس وقت جادُوگر اپنی اصلی صُورت میں آ گیا تھا۔

"ہاہاہا" جادُوگر نے مکروہ آواز میں قہقہہ لگایا۔ "پہلا شکار میرے قبضے میں آ گیا۔"

"مجھے جانے دو۔ مجھے چھوڑ دو۔" شہزادی سیفیہ چلائی "میں بادشاہ سلامت سے تمہاری شکایت کروں گی۔"

"چپ رہ، بد تمیز لڑکی!" جادُوگر نے دانت نکال کر اُسے ڈانٹا۔ "شکایت تو تُو اس وقت کرے گی جب میں تُجھے اس کمرے سے نکلنے کا موقع دوں گا۔ لیکن یہ موقع کبھی نہ ملے گا، کبھی نہیں۔"

شہزادی سیفیہ روتی رہی، جادُوگر کی منّت خوشامد کرتی رہی کہ اُسے چھوڑ دے

لیکن اس ظالم نے اُس کے رونے اور گڑ گڑانے کی کوئی پروانہ کی اور جھٹ ایک منتر پڑھ کر اُسے چھوٹی سی گڑیا بنادیا۔ اس کے بعد اُس نے گڑیا کو الماری میں بند کر کے باہر سے تالا ڈال دیا۔

اگلے جُمعے کر جب وہ دربار میں گیا تو وہاں بادشاہ موجود نہ تھا۔ تمام درباریوں، امیروں اور وزیروں چہرے غمگین تھے۔ بعض لوگ رو رہے تھے۔ مکّار جادُوگر نے پوچھا:

''کیا بات ہے؟ آپ لوگ اتنے پریشان کیوں ہیں؟ بادشاہ سلامت کے دُشمنوں کا مزاج کیسا ہے؟ خیر تو ہے؟''

تب وزیروں اور درباریوں نے اُسے بتایا کہ شہزادی سیفیہ کئی دن سے غائب ہے۔ خُدا جانے کہاں چلی گئی۔ اُسے کون اُٹھا کر لے گیا۔ سپاہیوں نے چاروں کھونٹ اس کو ڈھونڈا مگر کوئی پتا نہ چلا۔ شہزادی کے غم میں بادشاہ اور ملکہ کی حالت خراب ہے۔ انہوں نے کھانا پینا بھی چھوڑ دیا ہے۔ دن رات بس آنسو بہانے سے کام ہے۔ رعایا کا بھی یہی حال ہے کیوں کہ ہر شخص شہزادی سے محبّت

کرتا تھا۔

جادوگر نے درباریوں کے سامنے افسوس کا اظہار کیا، لیکن دل میں وہ بہت خوش تھا اور کہہ رہا تھا کہ بھلا شہزادی کو کون ڈھونڈ سکتا ہے۔ میں مر جاؤں، تب ہی ان لوگوں کو اُس کا سُراغ ملے گا۔

اگلے دن جادُوگر پھر ایک بوڑھی عورت کا روپ دھار کر محل کے اس حصّے میں پہنچا جہاں ملکہ رہتی تھی۔ اس وقت وہ بستر پر لیٹی شہزادی کی یاد میں آنسو بہا رہی تھی۔ اس کے آس پاس کوئی خادمہ نہ تھی۔ جادُوگر نے یہ موقع غنیمت سمجھا، جھٹ سے منتر پڑھا اور ملکہ پر پھُونک ماری۔ پلک جھپکتے میں ملکہ کا قد سُکڑ کے انگوٹھے کے برابر ہو گیا۔ جادُوگر نے جلدی سے اُسے جیب میں ڈالا اور وہاں سے رفو چکر ہو کر اپنے کمرے میں آ گیا۔

”ہاہاہا“ اُس نے کمرے میں داخل ہو کر خوشی سے قہقہہ لگایا۔ ”اب صرف بادشاہ کو پکڑنا ہے۔ اس کے بعد اس کی سلطنت میرے قبضے میں ہو گی۔“

اُس نے الماری کے سب سے اُوپر والے خانے میں ملکہ کو پھینک دیا اور پٹ بند کر

کے تالا لگا دیا۔

ملکہ کے گم ہونے کی خبر نے بادشاہ کو پاگل کر دیا۔ دن بھر وہ اپنے کمرے میں پڑا روتا رہا۔ امیر، وزیر اور درباری اُس کو تسلّی دینے آئے۔ لیکن اس کا رنج دُور نہ ہوا۔ سب مایوس ہو کر واپس چلے گئے۔

تیسرے دن جادُوگر نے پھر بڑھیا کا بھیس بھرا اور بادشاہ کے کمرے میں پہنچا۔ بادشاہ کو خبر بھی نہ ہوئی اور جادُوگر نے منتر کے زور سے اُسے بھی انگوٹھے کے برابر گُڈّے میں بدل دیا۔ پھر اپنے کمرے میں واپس آیا اور الماری کھول کر اُس میں پھینک دیا۔ اب اُس کا منصوبہ مکمل ہو چکا تھا۔

بادشاہ کے غائب ہونے سے سارے محل میں کُہرام مچ گیا۔ کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر شہزادی سیفیہ، ملکہ اور بادشاہ ایک ایک کر کے کہاں غائب ہو گئے۔ انہیں زمین نِگل گئی یا آسمان کھا گیا۔ بڑے بڑے نجومیوں اور جادُوگروں نے اُن کا پتا لگانے کی سر توڑ کوشش کی، لیکن سب ناکام رہے۔

شاہی خاندان کے اچانک غائب ہو جانے سے رعایا کے دن کا چین اور رات کا

آرام جاتا رہا۔ جس کو دیکھو، آنسو بہا رہا ہے۔ اب سوال یہ تھا کہ سلطنت کا انتظام کِس کے ہاتھ میں دیا جائے۔ سوچ سوچ کر تمام درباریوں اور وزیروں کی نگاہ اُسی خبیث جادُوگر پر پڑی۔ وہ اُسے بہُت عالم فاضل سمجھتے تھے۔ انہوں نے آپس میں فیصلہ کیا کہ جب تک بادشاہ کا پتا نہیں چل جاتا، اِس بوڑھے کو تخت پر بٹھا دیا جائے۔ چناں چہ وہ سب مل کر اُس کے پاس آئے اور اُس سے تخت سنبھالنے کی درخواست کی، جسے اس نے فوراً منظور کر لیا۔ وہ تو آیا ہی اِسی مقصد کے لیے تھا۔

بادشاہ بنتے ہی جادُوگر نے رعایا پر ظلم و ستم ڈھانا شروع کر دیا۔ لوگوں کے پاس جتنا سونا چاندی ہیرے جواہر تھے، سب چھین لیے۔ جو لوگ راضی خوشی اپنی دولت نہ دیتے اُن کے گھروں کی تلاشیاں لی جاتیں۔ انہیں قید خانوں میں ڈالا جاتا، جہاں جلّاد اُن بے گناہوں پر کوڑے برساتے۔

جادُوگر نے سینکڑوں مَن سونا جمع کر لیا، لیکن ابھی اُس کی ہوس پوری نہیں ہوئی تھی اور اُس کا لالچ روز بروز بڑھتا ہی جاتا تھا۔ سب درباری، امیر، وزیر اُس ظالم کے ہاتھوں نالاں تھے اور اُس وقت کو روتے تھے جب اُسے بادشاہ بنایا تھا۔

انہوں نے چپکے چپکے اپنے بادشاہ، ملکہ اور شہزادی سیفیہ کی تلاش جاری رکھی۔ لیکن اُن کا کہیں نام نشان نہ ملا۔

جِس الماری میں جادُوگر نے شہزادی سیفیہ کو گڑیا بنا کر بند کیا تھا، خدا کی قدرت سے اُس میں ایک چوہے نے سوراخ کیا اور اندر گھُس گیا۔ اُس کو سخت بھُوک لگی تھی اور اُسے اُمّید تھی کہ الماری میں کھانے کی کوئی چیز مل جائے گی۔ اس نے نزدیک آن کر شہزادی سیفیہ کو سُونگھا۔ شہزادی اُچھل کر پرے ہٹ گئی اور چوہا بھی ڈر کر ایک کونے میں دُبک گیا۔

"اچھے چوہے، اس الماری میں بڑا سا سوراخ کر دو تا کہ میں یہاں سے نِکل سکوں۔ میرا نام شہزادی سیفیہ ہے اور ایک بے رحم جادُوگر نے مجھے اس الماری میں قید کر رکھا ہے۔ اگر میں یہاں سے نہ نکلی تو تڑپ تڑپ کر مر جاؤں گی۔ میرے گُم ہونے سے امّی اور ابّا کس قدر پریشان ہو رہے ہوں گے۔ اچھے چوہے، کیا تم میری مدد نہیں کرو گے؟"

بے چاری شہزادی کو کیا معلوم کہ جادُوگر نے اُس کے ماں باپ کا کیا حشر کیا ہے

اور وہ دونوں بھی اُسی الماری کے سب سے اُوپر کے خانے میں قید ہیں۔

چُوہا ابھی تک کونے میں دبکا ہوا شہزادی کو گھور رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اُنگلی کے برابر بھی کوئی انسان ہو سکتا ہے۔ اِتنے میں شہزادی نے پھر کہا:

"اچھے چوہے، میری بات پر یقین کرو۔ میں جو کچھ کہہ رہی ہوں، وہ سب سچ ہے۔ میں اِس مُلک کے بادشاہ کی بیٹی ہوں۔ اگر تم نے مجھے اس جادُوگر کی قید سے آزاد کرا دیا تو میرا باپ تمہیں انعام دے گا۔ زندگی بھر تمہیں کھانے کے لیے اچھی اچھی چیزیں ملیں گی۔ تازہ روٹی، دودھ، مکھن، مکئی کے دانے اور بے شمار چیزیں۔ پھر خوب موٹے تازے ہو جاؤ گے۔"

"خدا تم پر رحم کرے، ننھی شہزادی۔" چوہے نے کہا "شاید تمہیں پتا نہیں کہ تمہارے امّی اور ابّا بھی غائب ہو چکے ہیں، اور جادُوگر نے تخت و تاج پر قبضہ کر لیا ہے۔"

چوہے کی زبانی یہ خبر سُن کر شہزادی سیفیہ رونے لگی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ نہ جانے اُس سنگ دل جادُوگر نے امّی اور ابّا کے ساتھ کیا سلوک کیا ہو گا۔

”چپ ہو جاؤ پیاری شہزادی، چُپ ہو جاؤ۔ میں تمہاری مدد کروں گا۔“ چوہے نے کہا۔ ”ممکن ہے بادشاہ اور ملکہ کو جادُو گر نے اِسی الماری کے کسی اور خانے میں بند کر رکھا ہو۔ میں ابھی تمام خانوں میں گھوم پھر کر دیکھتا ہوں۔ پھر تمہیں بتاؤں گا کہ وہ یہاں ہیں یا نہیں۔“

چوہے نے بہت جلد بادشاہ اور ملکہ کو تلاش کر لیا۔ جادُو گر نے ایسا منتر پھُونکا تھا کہ وہ نہ سانس لے سکتے تھے نہ حرکت کر سکتے تھے۔ چوہے نے واپس آن کر شہزادی کو یہ افسوس ناک خبر سُنائی۔ ”ہائے میں کیا کروں؟“ شہزادی رونے لگی۔ ”فرض کرو اگر میں کسی طرح اِس منحوس الماری سے باہر نِکل بھی گئی تو اپنے امّی ابّا کے کیا کام آسکتی ہوں۔ جادُو گر نے میرا قد گھٹا کر اُنگلی کے برابر کر دیا ہے۔ کیا میں ہمیشہ ایسی ہی رہوں گی۔“

”فکر نہ کرو شہزادی۔“ چوہے نے کہا ”جو لوگ خدا پر بھروسا رکھتے ہیں، خُدا ضرور اُن کی مشکل آسان کرتا ہے۔ میں ایک عقل مند بوڑھی عورت کو جانتا ہوں، جو ایک درخت کے کھوکھلے تنے میں رہتی ہے۔ شاید اُس کے پاس اس

ظالم جادُوگر کو تباہ کرنے کی کوئی تدبیر ہو۔"

"جلدی جاؤ، اچھّے چوہے، جلدی جاؤ اور اس عقل مند بڑھیا سے مل کر سارا ماجرا کہو۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور کوئی ایسی بات بتائے گی جس سے ہم اِس جادُوگر کے پھندے سے نکل سکیں۔"

رات کے وقت چوہا اپنے بل سے نکلا اور سیدھا جنگل کی جانب روانہ ہوا۔ اسے وہ کھوکھلا درخت اچھی طرح یاد تھا جس کے تنے ہیں وہ عقل مند بوڑھیا برسوں سے رہتی تھی۔ کسی کو بھی اُس کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا، سوائے جنگلی جانوروں اور پرندوں کے۔ چوہے نے اُسے سلام کیا اور ساری داستان سنائی، بڑھیا غور سے سنتی رہی۔ جب چوہا چُپ ہوا تو وہ بولی:

"شہزادی سیفیہ کو جا کر بتاؤ کہ جب چودھویں رات کا چاند نکلے تو وہ میرے پاس پہنچ جائے۔ پھر میں ایک تدبیر کروں گی جس پر عمل کر کے ظالم جادُوگر سے چھٹکارا پایا جا سکتا ہے، اور اُس کے امّی ابّا قید سے آزاد ہو سکتے ہیں۔ شہزادی سیفیہ کو الماری سے نکالنا تمہارا کام ہے۔ تم اُس خانے میں اتنا بڑا سوراخ کر دو کہ وہ

آسانی سے نکل سکے۔"

چوہا اسی وقت دوڑا ہوا جادُوگر کے کمرے میں گیا اور الماری میں جا گھُسا۔ شہزادی اُس کے انتظار میں جاگ رہی تھی۔ چوہے نے اُسے عقل مند بڑھیا سے ملاقات کی تمام تفصیل سُنائی۔ پھر تیزی سے لکڑی کی الماری کا ایک کونا کُترنا شروع کر دیا۔ مکّار جادُوگر اُس وقت اپنی شان دار مسہری پر پڑا خرّاٹے لے رہا تھا۔ اُسے خبر بھی نہ تھی کہ الماری کے اندر کیا کارروائی ہو رہی ہے۔ شہزادی سیفیہ کو الماری سے نکالنے کے لیے چوہے کو گھنٹوں لکڑی کاٹنی پڑی لیکن وہ تھکا نہیں۔ برابر اپنے کام میں لگا رہا یہاں تک کہ سوراخ اتنا بڑا ہو گیا جس میں سے شہزادی آسانی کے ساتھ باہر نکل سکتی تھی۔ "بہت بہت شکریہ، پیارے چوہے!" شہزادی نے خوش ہو کر کہا۔ "میں تمہارا یہ احسان کبھی نہ بھولوں گی۔"

اتفاق سے اگلے ہی روز چاند کی چودھریں تاریخ تھی۔ چاند نکلنے سے تھوڑی دیر پہلے شہزادی الماری میں سے نکلی اور چوہے کے ساتھ جنگل کی طرف دوڑی۔ محل میں جا بجا پہرے دار اور سپاہی گشت کر رہے تھے، لیکن کِسی کی نظر شہزادی پر نہ

پڑی، کیوں کہ وہ بہت چھوٹی تھی۔

جب وہ کھو کھلے درخت کے قریب پہنچی تو مشرق کی طرف سے آہستہ آہستہ چودھویں رات کا چاند نکل رہا تھا۔ عقل مند بڑھیا چوہے اور شہزادی کا انتظار کر رہی تھی۔

"آؤ، شہزادی سیفیہ، آؤ!" بڑھیا نے بڑی شفقت سے اُسے بلایا۔ "میں نے تمہاری مشکل کا ایک حل سوچ لیا ہے اور خُدا کی ذات سے اُمّید ہے کہ تم اُس کمینے جادُوگر کے پھندے سے اپنے والدین کو آزاد کرانے میں کام یاب ہو جاؤ گی۔ اب جو کچھ میں کہوں، اُسے کان لگا کر سُننا۔"

"آپ جیسا حکم دیں گی، میں ویسا ہی کروں گی، بڑی امّاں۔" شہزادی نے جواب دیا۔ "تھوڑی دیر بعد تم یہاں سے مغرب کی طرف چل پڑنا۔"

بڑھیا نے کہا۔ "جنگل سے نکل کر ایک چوراہے پر پہنچو گی۔ وہاں قریب ہی ایک کھلا میدان دکھائی دے گا۔ اُس میدان میں نارنجی رنگ کا ایک خوب صورت گھوڑا ملے گا جس پر زین کسی ہوئی ہو گی، جیسے سفر کے لیے بالکل تیّار ہے۔ میں

تمھیں اُس گھوڑے کو کھلانے کے لیے جادُو کی گھاس دیتی ہوں۔ یہ اس کے آگے ڈال دینا۔ گھوڑا گھاس کھالے تو چل کر اُس کی پیٹھ پر بیٹھ جانا۔ یہ فکر مت کرنا کہ تم اتنی چھوٹی ہو اور گھوڑا اتنا اونچا۔ جب تم اُچھلو گی تو خود بخود گھوڑے کی پیٹھ پر جا بیٹھو گی۔ اس کے بعد اس کے کان میں کہنا:

"اے نارنجی گھوڑے، مجھے سیبوں کے پاک درخت کے پاس لے چل تاکہ میں وہاں سے ایک سیب توڑ سکوں۔"

"کیا اس کے بعد میں اپنے اصلی قد پر واپس آ جاؤں گی، بڑی امّاں؟" شہزادی نے پوچھا۔

"نہیں۔۔۔ جب تک وہ مکّار جادُوگر مر نہیں جاتا تم اپنے اصلی قد پر واپس نہیں آ سکتیں۔ اصل میں جادُوگر کی جان اُس سیب میں ہے۔ جب تُم درخت سے سیب توڑ لو تو پھر گھوڑے کے کان میں کہنا: "اے نارنجی گھوڑے، تو مجھے اُس کنویں پر لے چل جس میں سبز رنگ کا اژدھا رہتا ہے۔ گھوڑا تمھیں پلک جھپکتے میں اُس کنویں تک پہنچا دے گا۔ وہ سیب اُس کنویں میں پھینک دینا، اژدھا اُس سیب کو کھا

لے گا اور ظالم جادُو گر اُسی وقت مر جائے گا۔"

"اس کے بعد کیا ہو گا، بڑی امّاں؟"

"جادُو گر کے مرتے ہی وہ تمام لوگ جنہیں اُس نے جادُو کے زور سے کچھ کا کچھ بنا دیا ہے، اپنی اصلی صورت پر آ جائیں گے۔" بڑھیا نے کہا۔ "اب تم دیر نہ کرو اور یہاں سے روانہ ہو جاؤ؟"

یہ کہہ کر اُس نے تھوڑی سی خُشک گھاس اُٹھائی اور اُس پر کچھ پڑھ کر پھونک دیا۔ شہزادی سیفیہ نے وہ گھاس اپنی پیٹھ پر باندھ لی۔ اُسے یوں لگا جیسے کئی مَن کا بوجھ اُس کی پیٹھ پر لاد دیا گیا ہو، حال آں کہ گھاس کا وزن مُشکل سے تین چار تولے ہو گا۔ پھر اُس نے بڑھیا کا شکریہ ادا کیا، اور چوہے سے کہا کہ وہ محل میں جا کر الماری کے قریب کہیں چھُپ جائے اور دیکھتا رہے کہ جادُو گر کیا کرتا ہے۔ اُس کے بعد وہ چاندنی رات میں دوڑتی ہو مغرب کی طرف چلی۔

جیسا کہ عقل مند بڑھیا نے بتایا تھا، جنگل کے پار ایک ایک چوراہا آیا۔ اس کے نزدیک ہی کھُلے میدان میں نہایت خوب صُورت نارنجی رنگ کا گھوڑا کسا کسایا

کھڑا تھا، جیسے کسی لمبے سفر پر جانے ہی والا ہو۔ شہزادی سیفیہ نے اس کے قریب پہنچ کر کہا:

”نارنی گھوڑے، نارنجی گھوڑے، لو یہ گھاس کھا لو۔ یہ میں تمہارے لیے لائی ہوں۔“

گھوڑے نے گردن گھما کر شہزادی سیفیہ کی طرف دیکھا اور خوش ہو کر ہنہنایا۔ سیفیہ نے جلدی سے گھاس اپنی پیٹھ سے اُتاری اور گھوڑے کے آگے ڈال دی۔ ایک ہی بار گھوڑے نے مُنہ میں رکھ کر نگل لی۔ پھر شہزادی اپنی پوری قوّت سے اُچھلی اور گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ گئی۔ اس نے گھوڑے کی گردن کے بال آگے سرک کر سختی سے پکڑ لیے۔ پھر اُس کے کان میں کہا:

”اے نارنجی گھوڑے، تو مجھے سیبوں کے پاک درخت کے پاس لے چل۔“

یہ سُن کر گھوڑا دوبارہ ہنہنایا اور پھر تیزی سے ایک طرف دوڑنے لگا۔ راستے میں بہت سے جنگل آئے، ندیاں نالے اور دریا آئے۔ پھر پہاڑ آئے۔ لیکن گھوڑا اُن سب میں سے گزرتا چلا گیا۔ آخر ایک خوب صورت باغ میں داخل ہوا۔ باغ کے

بیچوں بیچ سیب کا ایک اُونچا سا درخت کھڑا تھا۔ اس کی شاخوں میں بے شمار سُرخ سُرخ سیب لٹک رہے تھے۔ ان میں ایک سیب سب سے بڑا اور سب سے اُونچی شاخ پر لٹکا ہوا تھا۔ شہزادی نے دل میں کہا، یہ وہی سیب ہے جس میں ظالم جادُوگر کی روح ہے۔ وہ جھٹ پٹ درخت پر چڑھ گئی اور اس نے سیب توڑ لیا۔

"چلو نارنجی گھوڑے، اب تم مجھے اُس کنویں پر لے چلو جس میں سبز اژدہا رہتا ہے۔" شہزادی نے اُس کے کان میں کہا۔

گھوڑا ہنہنایا اور بجلی کی سی تیزی سے روانہ ہوا۔ وہ ہوا سے بھی زیادہ تیز رفتار تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اُس کے سُم زمین سے اُوپر اُٹھے ہوئے ہیں۔ پلک جھپکتے میں اُس نے شہزادی کو ایک چھوٹے سے نخلستاں میں پہنچا دیا، جہاں کھجوروں کے پانچ سات درختوں کے درمیان ایک بہت پُرانا کنواں بنا ہوا تھا۔

شہزادی نے کنویں میں جھانکا۔ ایک ہیبت ناک اژدہا بڑا سا مُنہ کھولے، کنویں کی تہہ میں بیٹھا تھا۔ شہزادی نے آنکھیں بند کر کے سیب کنویں میں پھینک دیا۔ سیب سیدھا اژدہے کے کھلے ہوئے مُنہ میں گرا۔ اُس نے فوراً اُسے چبا ڈالا۔ اُدھر

اژدہے نے سیب چبایا، اِدھر شہزادی سیفیہ کا قد ایک دم اپنی اصلی حالت پر آ گیا۔

"جادُوگر مر گیا۔۔۔ جادُوگر مر گیا۔" وہ خوش ہو کر چلّائی۔ اب اُسے گھوڑے پر سوار ہونے میں کوئی دقّت نہ ہوئی۔

"نارنجی گھوڑے، مجھے جہاں سے لے کر آئے تھے وہیں پہنچا دو۔" شہزادی نے گھوڑے کے کان میں کہا۔

گھوڑا تیزی سے بھاگنے لگا اور تمام جنگلوں، دریاؤں، میدانوں اور پہاڑوں میں سے ہوتا ہوا جب اُسی چوراہے پر آیا تو یہ دیکھ کر شہزادی بڑی حیران ہوئی کہ ابھی تک چاندنی رات ہے۔ جوں ہی وہ گھوڑے سے اُتری، ایک زوردار آواز سُنائی دی اور دوسرے ہی لمحے نارنجی رنگ کا گھوڑا نظروں سے غائب ہو گیا۔

شہزادی وہاں سے بھاگتی ہوئی شاہی محل کی جانب گئی۔ دُور ہی سے اُس کے کانوں میں خوشی کے شادیانے بجنے کی آواز آئی۔ محل کے تمام دروازوں اور چھتوں پر چراغ جل رہے تھے اور رعایا کے بے شمار آدمی محل کے باہر کھڑے خوشی سے

نعرے لگا رہے تھے۔ انہوں نے شہزادی کو کندھوں پر اُٹھا لیا اور اُچھلتے کودتے محل میں آ گئے۔

بادشاہ سلامت اور ملکہ اپنے کمرے میں تھے۔ شہزادی کو دیکھتے ہی دونوں دوڑے اور اُسے گلے لگا کے پیار کیا۔ پھر شہزادی نے اُنہیں شروع سے آخر تک ساری کہانی سُنائی۔ بادشاہ نے حبشی غلاموں کو حکم دیا کہ ابھی جادُوگر کے کمرے میں جائیں اور اُسے گرفتار کر کے ہمارے حضور میں پیش کریں۔ غلام ننگی تلواریں لیے جادُوگر کے کمرے میں گئے مگر یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہ پہلے ہی مرا پڑا ہے۔ اُس کی گردن ٹوٹی ہوئی تھی۔ غلاموں نے جادُوگر کی لاش لے جا کر بادشاہ کے سامنے پٹخ دی۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ اُس کی لاش کو بڑے دروازے پر لٹکا دیا جائے اور دو دن کے بعد اُسے آگ میں جلا دیا جائے۔

اگلے روز بادشاہ، ملکہ اور شہزادی سیفیہ عقل مند بڑھیا کا شکریہ ادا کرنے کے لیے جنگل میں گئے، لیکن یہ دیکھ کر اُن کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہ کھوکھلا درخت غائب ہو چکا ہے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ درخت کبھی اُس جنگل میں تھا ہی

نہیں۔ شہزادی سیفیہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہر طرف تلاش کر رہی تھی۔ یکایک ایک خوب صورت نوجوان نہایت شان دار کپڑے پہنے جنگل میں سے آیا اور جھک کر شہزادی، بادشاہ اور ملکہ کو سلام کیا۔ شہزادی نے تعجّب سے اُس کی طرف دیکھا اور کہا:

”نوجوان، تم کون ہو؟ میں نے تمھیں پہچانا نہیں۔“

نوجوان مُسکرایا اور کہنے لگا۔ ”افسوس ہے شہزادی، تم اِتنی جلدی مُجھے بھُول گئیں، حال آں کہ تُم نے وعدہ کیا تھا کہ بادشاہ سلامت سے کہہ کر مُجھے بہت سا انعام دلواؤ گی۔ میں اپنا انعام لینے آیا ہوں۔ تمھیں اپنا وعدہ پورا کرنا چاہیے۔“

”میں نے تم سے کوئی وعدہ نہیں کیا۔“شہزادی نے جواب دیا۔

”میں وہی چوہا ہوں، شہزادی، جس نے الماری میں سوراخ کر کے تمھیں قید سے نجات دلائی تھی۔“ نوجوان نے کہا ”مجھے بھی ایک شریر آدمی نے منتر پڑھ کر انسان سے چوہا بنا دیا تھا اور وہ شخص اِس ظالم جادُوگر کا شاگرد تھا۔ اس کے مرتے ہی میں بھی اپنی اصلی صورت میں آ گیا۔“

"ہم تم سے بہت خوش ہیں۔ نوجوان۔" بادشاہ نے کہا "اِطمینان رکھو، شہزادی سیفیہ نے جو وعدہ کیا ہے، وہ ہم ضرور پورا کریں گے۔ آؤ ہمارے ساتھ بادشاہ نوجوان کو محل میں لے گیا اور جب شہزادی سیفیہ جوان ہو گئی تو بادشاہ نے اُس کی شادی اُس نوجوان سے کر دی۔ کچھ عرصے بعد جب بادشاہ نے وفات پائی تو رعایا نے سیفیہ کے شوہر کو اپنا بادشاہ بنا لیا، کیوں کہ وہ بہت عقل مند، رحم دل اور انصاف پسند نوجوان تھا۔ یوں اُسے اپنی نیکی کا صلہ مل گیا۔

ایک گونگا، تین بہرے

ایک دفعہ کا ذکر ہے، کسی گاؤں میں ایک چرواہا رہتا تھا۔ بے چارہ بہرا تھا۔ خواہ اس کے کان پر چیخو خواہ ڈھول بجاؤ، اُسے بالکل خبر نہ ہوتی۔ اس کے پاس پچاس ساٹھ بکریاں تھیں، جنہیں چرانے کے لیے وہ گاؤں سے باہر جنگل میں جاتا تھا۔ دن بھر جنگل میں بکریوں کے پیچھے پیچھے پھرتا اور جب سُورج ڈوبنے لگتا تو بکریوں کو ہانکتا ہوا گاؤں واپس آجاتا۔

ایک روز دوپہر کو چرواہے کو بھوک لگی تو اُس نے اپنی روٹیوں کی پوٹلی تھیلے سے نکالنی چاہی، لیکن تھیلے میں پوٹلی تھی ہی نہیں۔ وہ حیران ہو کر سوچنے لگا کہ آخر پوٹلی گئی کہاں؟ سوچتے سوچتے اُسے یاد آیا کہ بیوی نے روٹیوں کی پوٹلی باندھ کر دی تو تھی، لیکن وہ اُسے تھیلے میں رکھنا بھول گیا۔ اُس کا خیال تھا کہ جب بیوی کو پتا چلے گا کہ وہ روٹیوں کی پوٹلی گھر میں بھول گیا ہے، تو وہ خود لے کر چلی آئے گی۔

لہٰذا وہ بیوی کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔

انتظار کرتے کرتے چرواہے کی آنتیں قُل ھو اللہ پڑھنے لگیں اور پیٹ میں چوہے قلابازیاں کھانے لگے۔ بار بار اُس کی نظریں اِس اُمّید میں گاؤں کو جانے والی پگڈنڈی پر اُٹھ جاتیں کہ شاید بیوی روٹی لے کر آ رہی ہو، مگر ہر بار مایوس ہو کر واپس آ جاتیں۔ اُس نے سوچا، ممکن ہے بیوی نے لڑکے کے ہاتھ روٹیاں بھجوائی ہوں، مگر وہ شاید گلی کے لڑکوں کے ساتھ کھیل کود میں لگ گیا ہو گا۔ یہ سوچتے ہی چرواہے کا مگر مُنہ غصّے سے لال ہو گیا۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کچھ فاصلے پر ایک گھُڑسوار درانتی سے درختوں کی نرم نرم شاخیں اور پتے کاٹ رہا تھا۔ چرواہا لپک کر اُس کے پاس گیا اور کہنے لگا:

"بھائی، تمہاری بڑی مہربانی ہو گی اگر تم ذرا اِن بکریوں کا دھیان رکھو۔ میں اپنی دوپہر کی روٹی گھر بھُول آیا ہوں۔ بھُوک کے مارے جان نکلی جا رہی ہے۔ بس جلدی سے دو چار نوالے زہر مار کر کے واپس چلا آؤں گا۔ تم ذرا بکریوں کو دیکھتے رہنا۔ کہیں کوئی بکری اِدھر اُدھر نہ ہو جائے۔" اب مزے دار بات یہ ہوئی کہ

وہ گھوڑے والا بھی بہرا تھا۔ چرواہے نے جو کچھ اُس سے کہا، اُس کا ایک لفظ بھی اُس نے نہ سُنا۔ اس کے بجائے وہ یہ سمجھا کہ چرواہا اُس سے اپنی بکریوں کے لیے پتّے مانگ رہا ہے۔ اُس نے جواب دیا:

"چلو چلو، چلتے بنو یہاں سے۔ اتنی محنت سے تو میں نے اپنے گھوڑے کے لیے پتّے جمع کیے ہیں اور تم آ گئے مفت میں مانگنے۔ دفعان ہو جاؤ۔ میں تمھیں ایک پتّا بھی نہیں دوں گا۔"

یہ کہہ کر گھوڑے والے نے ہاتھ سے چرواہے کو بھاگ جانے کا اشارہ کیا۔ اس کی ایک بات بھی چرواہے کی سمجھ میں نہ آئی، لیکن اُس نے مطلب یہ نکالا کہ وہ کہہ رہے، ہاں ہاں بھائی بڑے شوق سے روٹی کھانے جاؤ۔ جب تک تم واپس نہیں آ جاتے، میں تمہاری بکریوں کی دیکھ بھال کرتا رہوں گا۔ یہ سمجھ کر چرواہا اپنے گاؤں کی طرف بھاگا۔

اس نے سوچا تھا کہ روٹی نہ لانے پر وہ بیوی کو خُوب بُرا بھلا کہے گا، لیکن یہ دیکھ کر اُس کی پریشانی کی حد نہ رہی کہ بیوی بے چاری بستر پر پڑی بخار میں پھُنک رہی

ہے۔ پڑوسن اُس کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ چرواہا بھاگا بھاگا حکیم کے پاس گیا اور اُس سے دوا لے کر آیا۔ پھر اُس نے جلدی جلدی روٹیوں کی پوٹلی کھولی، بڑے بڑے لقمے نگلنے، پانی غٹ غٹا کر پیا اور دوبارہ جنگل کی طرف روانہ ہوا۔

وہاں جا کر اُس نے دیکھا کہ گھوڑے والا ایک طرف بیٹھا ہے۔ بکریاں گھاس چر رہی ہیں۔ چرواہے نے دل میں کہا اگر آج یہ شخص نہ ہوتا تو میں بکریاں کس کے حوالے کر کے جاتا۔ اُس شخص نے اپنے وقت کا کتنا ہرج کیا اور بکریوں کی نگرانی کے لیے ابھی تک بیٹھا ہوا ہے۔ میں اِس کی مہربانی کا کیا بدلا دے سکتا ہوں۔ ہاں یاد آیا۔ میرے پاس جو لنگڑی بکری ہے، وہ اِسے کیوں نہ دے دوں۔ اُس کا گوشت بھون کر خود بھی کھائے گا اور اپنے بال بچّوں کا پیٹ بھی بھرے گا۔

چرواہے نے اُس لنگڑی بکری کو اپنے کندھوں پر اُٹھایا اور گھوڑے والے کے پاس آن کے بولا:

”بھائی، میں تمہاری مہربانی کا بہت شکر گزار ہوں۔ معاف کرنا، مجھے کچھ دیر ہو گئی۔ اصل میں میری بیوی بیمار ہو گئی اور میں اُس کی دوا لینے کے لیے چلا گیا۔

میری طرف سے اِس بکری کا تحفہ قبول کرو۔" گھوڑے والا، جو اصل میں لکڑہارا تھا، چرواہے کا ایک لفظ بھی نہ سُن سکا۔ وہ یہ سمجھا کہ یہ بکری شاید کسی درخت پر چڑھتے ہوئے گر پڑی اور اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ اب اس کا ذمّے دار یہ مجھے ٹھہرا رہا ہے۔ یہ سوچ کر اُس کا خُون کھول گیا۔ اُس نے چلّا کر کہا:

"تم اور تمہاری بکری جائے جہنّم میں۔ میں کیا تمہارے باوا کا نوکر تھا جو تمہاری بکریوں کی نگرانی کرتا؟ اگر اِس کی ٹانگ ٹوٹی تو میں کیا کروں؟ غارت ہو جاؤ میرے سامنے سے۔"

چرواہا یہ سمجھا کہ وہ کہہ رہا ہے، یہ بکری مجھے پسند نہیں۔ کوئی دودھ دینے والی بکری دینی ہے تو دے دو۔ اس نے کہا:

"بھائی، میں غریب آدمی ہوں، انہی بکریوں کا دودھ بیچ کر گزارا کرتا ہوں۔ دودھ والی بکری میں دے دوں تو اپنا پیٹ کہاں سے بھروں گا؟ تم یہی بکری لے لو۔"

"ارے بے وقوف! میں کہتا ہوں یہاں سے بھاگ جاؤ۔" لکڑہارا پھر چلّایا۔ اس کا

خیال تھا کہ چرواہا دھمکیاں دے رہا ہے کہ اگر تم نے بکری کی قیمت ادا نہ کی تو بہت بُرا ہو گا۔ "میں تمہاری بکریوں پر لعنت بھیجتا ہوں۔ مجھے ان سے کوئی دلچسپی نہیں۔ مجھے تو یہ بھی خبر نہیں کہ تمہاری یہ شریر بکریاں کس طرف چر رہی تھیں۔ اب زیادہ میرا مغز نہ کھاؤ، ورنہ میں تمہیں ماروں گا۔"

چرواہے نے دیکھا کہ لکڑہارے کی آنکھیں سُرخ ہو گئی ہیں اور نتھنے پھڑک رہے ہیں۔ وہ حیران تھا کہ آخر اس میں ناراض ہونے کی کون سی بات ہے! میں نے اِس شخص کو گالی تو نہیں دی۔ بکری کا تحفہ ہی پیش کیا تھا۔ اس نے پھر اس سے بکری قبول کرنے کہ درخواست کی، مگر لکڑہارا غصّے سے پاگل ہو رہا تھا۔ اُس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اُٹھ کر ایک گھونسا چرواہے کے مارا۔ چرواہے کو بھی طیش آ گیا۔ اس نے جواب میں دو گھُونسے اس کی پسلیوں میں رسید کیے۔ پھر دونوں میں ایسی خُوفناک لڑائی ہوئی کہ توبہ ہی بھلی۔ ان کی لڑائی دیکھ کر لکڑہارے کا گھوڑا ہنہنایا۔ اِدھر چرواہے کی بکریاں مل کر مَیں مَیں کرنے لگیں۔

اِتنے میں ایک مسافر، گھوڑے پر سوار، اُدھر سے گزرا اور اِن دونوں کو لڑتے

دیکھ کر نزدیک آیا۔ پوچھنے لگا:

”بھئی کیا بات ہوئی؟ کیوں لڑ رہے ہو؟“

چرواہے نے کہا ”دیکھیے جناب، میں اسے لنگری بکری مفت دے رہا ہوں کیوں کہ اِس نے میری بکریوں کی رکھوالی کی ہے مگر یہ دودھ والی بکری لینا چاہتا ہے۔ جب میں نے انکار کیا تو لڑنے مرنے پر تُل گیا۔“

مُسافر نے اپنے بائیں کان پر ہاتھ رکھا اور زور سے بولا۔ ”بھئی، معاف کرنا میں ذرا اُونچا سنتا ہوں۔ تمہاری بات میرے پلّے نہیں پڑی۔ پھر سے کہو اور ہاں، ذرا اُونچی آواز سے۔“

اتنے میں لکڑہارے نے اپنا بیان شروع کر دیا۔ وہ سمجھا کہ مسافر اُس سے پوچھ رہا ہے کہ تم بتاؤ کیا واقعہ پیش آیا؟ لکڑہارے نے اُس کے گھوڑے کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا:

”جنابِ والا، میں اپنے گھوڑے کے لیے جنگل میں سے گھاس کاٹ رہا تھا کہ یہ کم

بخت چرواہا نہ جانے کہاں غائب ہو گیا اپنی بکریوں کو چھوڑ کر۔ پھر بہت دیر میں واپس آیا اور ایک لنگڑی بکری لا کر میرے سامنے ڈال دی اور کہنے لگا کہ اِس کی ٹانگ تو نے توڑی ہے۔ اب میں اتنی دیر سے اِسے سمجھا رہا ہوں کہ بکری کی ٹانگ میں نے نہیں توڑی، لیکن یہ مانتا ہی نہیں۔ برابر وہی رٹ لگائے جا رہا ہے۔ تنگ آمد بجنگ آمد۔ میں نے پہلے زبان سے سمجھایا، لیکن آپ جانتے ہیں کہ لاتوں کے بھُوت باتوں سے نہیں مانتے۔ میں نے اُس کی خوب ٹھکائی کی، تب ہوش ٹھکانے ہوئے۔ اب آپ ہی اسے سمجھائیے۔"

مسافر حیرت سے مُنہ کھولے لکڑہارے اور چرواہے کی طرف دیکھ رہا تھا، اُسے ان کے مُنہ سے نکلا ہوا ایک لفظ بھی سنائی نہ دیا۔ وہ بھی انہی دونوں کی طرح کانوں سے بہرا تھا۔ جب لکڑہارے نے اس کے گھوڑے کی طرف اشارہ کیا تو وہ ایک دم ڈر گیا۔ ہکلاتے ہوئے بولا:

"ہاں ہاں۔۔۔ یہ گھوڑا میرا نہیں۔ میں تو پیدل سفر کر رہا تھا کہ ایک جگہ جنگل میں یہ مجھے آوارہ پھرتا ہوا نظر آیا۔ میں نے اُسے لکڑ لیا۔ اب آپ لوگ کہتے ہیں کہ

یہ گھوڑا آپ کا ہے تو میں اسے آپ کے حوالے کرتا ہوں۔ اُمّید ہے آپ میری اس حرکت کو معاف کر دیں گے۔"

یہ کہہ کر مسافر نے اپنا گھوڑا وہیں چھوڑا اور اندھا دُھندھ ایک طرف بھاگ نکلا۔ اُس کا خیال تھا کہ ایسا نہ ہو یہ لوگ مجھے گھوڑے کی چوری کے جرم میں پکڑ کر قاضی کے پاس لے جائیں اور وہ مجھے قید خانے میں ڈال دے۔ اُسے یوں بھاگتے دیکھ کر لکڑہارا اور چرواہا دونوں اس کے پیچھے دوڑے اور دیر تک تعاقب کرنے کے بعد آخر کار اُسے پکڑنے میں کام یاب ہو گئے۔ پھر وہ اُسے کھینچتے ہوئے واپس وہیں لائے اور اصرار کرنے لگے کہ جب تک تم ہمارے جھگڑے کا فیصلہ نہیں کر دیتے تمھیں جانے کی اجازت نہیں ملے گی۔

ابھی ان تینوں بہروں میں تکرار ہو رہی تھی کہ ایک فقیر اُدھر آ نکلا۔ تینوں نے اُسے گھیر لیا اور باری باری اپنا مُقدمہ بیان کرنے لگے۔ فقیر ان کی باتوں کا ایک ایک لفظ اچھی طرح سُن رہا تھا، لیکن وہ کوئی فیصلہ سُنانے سے عاجز تھا۔ کیوں؟ اس لیے کہ وہ پیدائشی گونگا تھا۔

اُس نے اُن تینوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا فقیر کی آنکھوں میں کچھ ایسی چمک تھی کہ یہ تینوں خوف زدہ ہو گئے۔ فقیر برابر اُنہیں دیکھتا رہا۔ اُنہیں ایسا لگا جیسے اُس کی نگاہیں اُن کی کھوپڑیوں کے پار ہوتی جا رہی ہیں۔ یکایک گھوڑے والا مسافر اپنے گھوڑے پر سوار اور گھوڑے کو اُڑا کر وہاں سے آناً فاناً رفو چکر ہو گیا۔

لکڑہارے نے بھی جلدی جلدی گھاس اور پتّے اپنی پیٹھ پر لادے اور بھاگ نکلا۔

چرواہے نے اپنی بکریوں کو ہانکا اور گاؤں کی جانب روانہ ہوا۔ فقیر وہیں کھڑا انہیں دیکھتا اور مُسکراتا رہا۔ جب یہ تینوں بہرے اُس کی نظروں سے اوجھل ہو گئے تو وہ بھی اپنی راہ پر ہو لیا۔ اس نے سوچا، بے شک بولنے کی قوّت بہت بڑی نعمت ہے لیکن اگر کوئی شخص میری طرح گونگا ہو تو یہ آنکھیں بھی بہت بڑی نعمت ہے۔

لالچی سوداگر

ایک دفعہ کا ذکر ہے، شہر بصرہ میں دو دوست رہتے تھے۔ ایک کا نام ابراہیم اور دوسرے کا یُوسف تھا۔ دونوں بچپن کے دوست تھے۔ جوان ہوئے تو انہوں نے تجارت کا پیشہ اختیار کیا۔ اب خُدا کی قدرت کہ ابراہیم تجارت میں بہت کامیاب رہا۔ اس نے دنوں ہی میں بے انتہا دولت کمائی۔ مٹّی کو بھی ہاتھ لگاتا تو سونا ہو جاتی۔ لیکن یُوسف ہمیشہ نقصان ہی اُٹھاتا رہا، حالآنکہ وہ بہت محنت اور توجّہ سے کام کرتا تھا۔

ایک دفعہ یُوسف کو پتا چلا کہ جن بحری جہازوں پر اس نے اپنا تجارتی سامان دوسرے ملکوں کو روانہ کیا تھا، وہ سب کے سب جہاز سمندر میں ڈوب گئے۔ اس خبر نے یُوسف کی کمر توڑ دی۔ یہ نقصان اُس کے لیے ناقابلِ برداشت تھا، مگر اُس نے صبر اور حوصلے سے کام لیا اور یہی کہا کہ جو خدا کو منظور تھا، وہی ہوا اور شاید

اِسی میں میرے لیے کوئی بہتری ہو گی۔

دوسری طرف اس کا دوست ابراہیم یہ خبر سُن کر دل ہی دل میں خوش ہوا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ یُوسف تجارت میں کامیابی حاصل کرے اور میرے مُقابلے میں اس کا بھی نام لیا جائے۔ وہ تو بصرے کا سب سے بڑا اور سب سے دولت مند تاجر کہلانا پسند کرتا تھا۔

ابراہیم نے اپنی کامیابی پر ایک مرتبہ بھی خدا کا شکر ادا نہیں کیا۔ وہ بڑے غرور سے کہا کرتا تھا کہ میں خُدا کا شکر کیوں ادا کروں؟ میں نے جو کچھ کمایا ہے اپنی عقل مندی، ہوشیاری اور کاروباری سوجھ بوجھ کی بدولت کمایا ہے۔ اس نے ایک بار بھی یہ نہ سوچا کہ اس مُصیبت میں اسے اپنے بچپن کے دوست یُوسف کی مدد کرنی چاہیے۔

یُوشت ایک رات کو دو بجے کے قریب، اپنے گھر جا رہا تھا کہ اندھیرے میں ٹھوکر کھا کر ایک کنویں میں ِگر گیا۔ لیکن وہ ہوش میں رہا اور کنویں میں سے نکلنے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر یہ کام اتنا آسان نہ تھا۔ تھک ہار کر اُس نے مدد کے لیے

پکارنا شروع کر دیا۔ دیر تک بُری طرح چیختا رہا، مگر رات کے پچھلے پہر اس سنسان علاقے میں کون آتا۔ چیختے چیختے جب اُس کا گلا بیٹھ گیا اور وہ اپنی زندگی سے مایوس ہو گیا تو یکایک اُس کے کانوں میں ایک آواز آئی۔ کوئی کہہ رہا تھا:

"اے انسان میں تیری مدد کروں گا۔ لا، اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے۔"

یُوسف نے اپنا ایک ہاتھ اُونچا کیا۔ دوسرے ہی لمحے ایک بہت مضبوط ہاتھ نے اُسے پکڑ کر ایک ہی جھٹکے میں کنویں سے باہر نکال لیا۔ یوسف نے دل میں کہا، یہ کوئی بُہت ہی طاقتور آدمی ہے۔ چوں کہ وہاں سخت اندھیرا تھا، اس لیے وہ اپنے محسن کی صورت نہ دیکھ سکا۔

"تمہارا بہت بہت شکریہ، بھائی۔" یُوسف نے کہا۔ "اللہ تمہارا بھلا کرے۔ اس وقت تو رحمت کے فرشتے ثابت ہوئے۔ اب مہربانی فرما کر یہ بتاؤ کہ تم کون ہو اور میں کسی طرح تمہارے احسان کا بدلہ اُتار سکتا ہوں۔"

"میں جِن ہوں۔" آواز آئی۔ "اور اگر تم میرا ایک کام کر دو تو میں سمجھوں گا کہ تم نے میرے احسان کا بدلہ چُکا دیا۔"

”تم جِن ہو!“ یوسف نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”لیکن کون سے جِن؟ شریر یا نیک؟“ اس نے سُن رکھا تھا کہ بعض جِن نیک ہوتے ہیں اور بعض شریر، اور جو شریر ہوتے ہیں وہ انسانوں کو اپنا غلام بنا لیتے ہیں۔

”میں ایک چھوٹا سا جِن ہوں۔“ جواب ملا۔ ”اگر شریر ہوتا تو تمھیں کنویں میں سے ہرگز ہرگز نہ نکالتا۔ چھوٹا ہونے کے باوجود میں انسانوں سے زیادہ طاقتور ہوں۔ مُجھے بہت دِنوں سے ایک ایسے آدمی کی تلاش تھی جو میرا ایک چھوٹا سا کام کر سکے۔ لیکن میں جب کسی آدمی سے ایسی درخواست کرتا، وہ ڈر کے مارے بھاگ جاتا۔ بولو، کیا تم میرا کام کرو گے؟“

”ضرور کر دوں گا، بشرطے کہ وہ میری طاقت اور ہمّت سے باہر نہ ہو۔“ یُوسف نے جواب دیا۔

”تمھارے لیے وہ کچھ بھی مشکل نہیں۔“ جِن نے کہا۔ ”آؤ، اب میرے ساتھ ایک جگہ پر۔ وہ کام وہیں پہنچ کر بتاؤں گا۔“

جِن یُوسف کو ایک اُجاڑ اور پرانے مکان میں لے گیا۔ اس کی دیواریں گِر چکی

تھیں۔ دروازے اور کھڑکیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ جابجا چوہوں نے بِل بنا رکھے تھے اور چھتوں پر چمگادڑیں پھڑپھڑا رہی تھیں۔ ”اس مکان میں ایک خفیہ تہہ خانہ ہے۔“ جِن نے یُوسف سے کہا۔ ”لیکن اس کا راستہ بند ہے۔ جِنوں کی طاقت نہیں کہ اُس راستے کو کھول سکیں۔ ہاں، کوئی آدمی ایسا کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں تمہیں یہاں لایا ہوں۔ “

”بولو، میں کیا کروں؟“ یوسف نے پوچھا۔

”مکان کے صحن میں ایک لوہے کا کڑا لگا ہے۔؛ جِن نے کہا۔ ”تم صرف اُس کڑے کو پکڑ کر اُوپر اُٹھاؤ۔ یہ اُس تہہ جانے کا راستہ ہے، جسے ایک سِل کے ذریعے بند کر دیا گیا ہے۔ میں تہہ خانے میں اُتروں گا۔ آگے جو کچھ ہو گا، وہ تُم خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا۔“

یُوسف نے خدا کا نام لے کر لوہے کا کڑا اُٹھایا۔ اسے ہٹاتے ہی پتھّر کی بھاری سِل اپنی جگہ سے سِرک گئی اور اب کھُلے مُنہ کا ایک غار دکھا دینے لگا۔ جِن فورا! اُس میں اُتر کر غائب ہو گیا۔ یوسف وہیں حیران پریشان کھڑا تھا۔ اِتنے میں جِن تہہ

خانے سے باہر آیا۔ اُس کے ہاتھوں میں مٹی کی ایک بڑی سی رکابی تھی، جس میں اُوپر تک سونے کی اشرفیاں بھری تھیں۔

"خزانہ!" یوسف نے ایک دم کہا۔ "تمھیں کیسے پتا چلا کہ اِس مکان میں خزانہ چھُپا ہوا ہے؟"

"دنیا بھر میں جتنے خزانے زمین میں دفن ہیں، ہم جِنّات ان سب کی خبر رکھتے ہیں۔" جِن نے جواب دیا۔ "اس مکان میں دبے ہوئے خزانے کے بارے میں مُجھے دو سو برس پہلے ہی سے پتا تھا۔ اُس زمانے میں یہ مکان ایک جادُوگر کا تھا اور اُس نے مجھے قابُو میں کر لیا تھا۔ سو برس تک میں اُس جادُوگر کا غلام بنا رہا۔ اِس کے بعد وہ مر گیا۔ مرنے سے پہلے اُس نے اپنا تمام خزانہ اس مکان کے تہہ خانے میں دبا دیا تھا۔ تم ذرا یہیں رُکو میں ابھی آتا ہوں۔"

جِن نے یُوسف سے کہا اور دوبارہ تہہ خانے میں اُتر گیا۔ یُوسف کے سامنے اشرفیوں سے بھری ہوئی رُکابی دھری تھی اور سونے کے سکّے اندھیرے میں بھی جھِل مِل جھِل مِل کر رہے تھے۔ کاش! ان میں سے چند اشرفیاں مُجھے مل

جائیں تا کہ میں دوبارہ تجارتی سامان خرید سکوں، یُوسف نے دل میں کہا۔ اِتنے میں جِن دربارہ نمودار ہوا۔ اِس مرتبہ اُس کے ہاتھوں میں اشرفیوں سے لبالب بھری ہوئی ایک اور رُکابی تھی۔ وہ بھی اُس نے یُوسف کے سامنے رکھ دی۔

"یہ تمام اشرفیاں تم لے سکے ہو۔" جِن نے کہا۔ "لیکن اِن کے عوض تمہیں میرا ایک اور کام کرنا ہو گا۔"

"وہ کیا؟" یُوسف نے پوچھا۔ مارے خوشی کے اُس کا دِل بلّیوں اُچھل رہا تھا۔

"تم جہاں کہیں بھی جاؤ گے، تمہارا فرض ہو گا کہ مُجھے اپنے کندھوں پہ اُٹھا کر لے چلو۔ تم دیکھتے ہو کہ میں بُہت بڑا جِن نہیں ہوں۔ جادُوگر کی ایک سو برس کی غُلامی میں میری ٹانگیں کمزور ہو گئی ہیں اور مجھے چلنے پھرنے میں دشواری ہوتی ہے۔ اگر تم میری خدمت بجا لاؤ تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں اور بہت سی اشرفیاں دوں گا۔ مجھے اِن اشرفیوں کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ تُم مجھے اپنے کندھوں پر بٹھالو اور جگہ جگہ کی سیر کراؤ۔"

"نہیں، نہیں۔" یُوسف نے کہا۔ "یہ کام میرے لیے ناممکن ہے۔ بالکل ناممکن۔

مجھے تمہاری اِن اشرفیوں کی ضرورت نہیں ہے۔ کیا تم اِس معمولی سے سونے کے عوض مجھے ہمیشہ کے لیے اپنا غلام بنانے کا ارادہ رکھتے ہو؟ بس اب میں اپنے گھر جاتا ہوں۔ تمہاری اشرفیاں تمہیں مبارک۔"

"ٹھہرو! تم یوں نہیں جاسکتے۔" جِن کے تیور ایک دم بدل گئے۔ "اگر تُم نے میرا کہا نہ مانا تو میں تمہیں اس ویران مکان میں قید کر دوں گا اور تم بھوکے پیاسے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاؤ گے۔ یہ کام میں کسی اور آدمی سے بھی لے سکتا ہوں لیکن مجھے معلوم ہے کہ تمہیں آج کل پیسوں کی سخت ضرورت ہے۔ اس لیے یہ پیشکش میں نے تمہیں کی ہے۔ بے وقوف مت بنو، یُوسف سوداگر۔ اگر میری بات مان لو اور اِس پر عمل کرو، زندگی بھر عیش کرو گے۔"

"نہیں، نہیں۔۔۔ میں تمہاری غلامی سے موت کر بہتر سمجھتا ہوں۔" یُوسف نے جواب دیا۔ "بے شک تُم نے مُجھے کنویں میں سے نکالا۔ اس کے لیے میں تمہارا شکر گزار ہوں۔ لیکن اتنی خدمت کا جو معاوضہ تم مجھ سے وصول کرنا چاہتے ہو، وہ میں کبھی نہیں دوں گا۔ ہٹ جاؤ میرے راستے سے، اور مجھے گھر جانے دو۔"

یہ کہہ کر اس نے قدم بڑھایا، لیکن جِن نے اُس کا راستہ روکنے کی کوشش کی اور اُس کی گردن پکڑنے کے لیے دونوں ہاتھ بڑھائے۔ یُوسف نے پوری قوّت سے جِن کو دھکا دیا۔ جِن لڑکھڑایا۔ پھر اُس کے مُنہ سے زوردار چیخ نکلی اور وہ تہہ خانے میں گِر گیا۔ یوسف نے لپک کر پتھر کی سِل اُٹھائی اور تہہ خانے کے مُنہ پر رکھ دی۔ اب جِن باہر نہیں نِکل سکتا تھا۔ اس کے بعد یُوسف نے جلدی جلدی دونوں رُکابیوں کی اشرفیاں سمیٹ کر رُومال میں باندھیں اور سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔

اُس نے اِن اشرفیوں سے کئی تجارتی جہاز خریدے۔ بگڑی ہوئی قسمت نے پلٹا کھایا۔ کاروبار میں نفع بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ دن بھی آیا جب وہ بصرے کا سب سے دولت مند تاجر بن گیا۔

اس کا دوست ابراہیم حسد کے مارے انگاروں پر لوٹ رہا تھا۔ اس نے بہت دماغ لڑایا مگر کچھ سمجھ میں نہ آسکا کہ آخر یُوسف کی اِس کامیابی کا سبب کیا ہے۔ تھک ہار کہ ایک روز اُس نے یُوسف کو اپنے گھر بلایا اور اس کی خاطر تواضع کرنے کے

بعد باتوں باتوں میں پوچھا:

"یار، یہ تو بتاؤ کہ آخر تم نے یہ کیا جادُو کیا کہ بصرے کے تمام تاجروں کو پیچھے چھوڑ گئے۔ یہ کاروباری گُر ہمیں بھی سمجھاؤ۔"

یُوسف نے پہلے تو ابراہیم کو ٹالنے کی بڑی کوشش کی لیکن جب وہ جھاڑ کا کانٹا بن کر لپٹ گیا تو مجبور ہو کر شروع سے آخر تک ساری داستان سُنا ڈالی۔ ابراہیم حیرت سے مُنہ کھولے اور آنکھیں پھاڑے سب کچھ سُنتا رہا۔

آخر میں یُوسف نے اسے اُس ویران اور اجڑے ہوئے مکان کا پتا دیا اور خبر دار کرتے ہوئے کہا۔ "دیکھو بھائی ابراہم، وہاں ہر گز نہ جانا ورنہ نامعلوم وہ شریر جِن تمہارے ساتھ کیا سلوک کرے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تمہاری پیٹھ پر سوار ہو جائے اور مرتے دم تک تمہیں آزاد نہ کرے۔"

"نہیں نہیں۔ بھلا مُجھے وہاں جانے کی کیا ضرورت ہے۔" ابراہیم نے جواب دیا۔ لیکن دل میں وہ سوچ رہا تھا کہ یُوسف نے جو کہانی سُنائی ہے، سچ ہے یا جھوٹ؟ میرا خیال ہے کہ اِس نے مُجھے ٹالنے کے لیے یہ گپ گھڑی ہے۔ اس کا جھوٹ سچ

پرکھنے کی یہی صورت ہے کہ میں اُس مکان میں جاؤں اور وہ تہہ خانہ تلاش کرنے کی کوشش کروں۔ کیا خبر وہاں اشرفیوں کا خزانہ موجود ہی ہو۔ اگر جِن وہاں ہوا بھی تو میں منّت خوشامد کر کے اُسے راضی کروں گا۔ وہ مجھے کچھ نہیں کہے گا۔

یُوسف کو رُخصت کرنے کے بعد ابراہیم نے اپنی بیوی سے کہا۔ "میں ایک ضروری کام سے باہر جارہاہوں۔ ذرا دیر سے واپس آؤں گا۔ فکر مت کرنا۔"

بیوی نے بہت پوچھا کہ رات کو اِس وقت کہاں جارہے ہو لیکن ابراہیم نے اُسے نہ بتایا۔ صرف اتنا کہا کہ میں ایسے کام پر جارہاہوں کہ جس میں کامیابی کے بعد میں تمہیں سونے کے زیوروں میں سر سے پاؤں تک لاد دوں گا۔ اس کی بیوی کو زیوروں کا بڑا لالچ تھا۔ اس نے خوشی خوشی اس کو جانے کی اجازت دے دی۔

ابراہیم نے بہت جلد وہ بوسیدہ پرانا مکان ڈھونڈ لیا جس کا ذکر یُوسف نے کیا تھا۔ وہ اپنے ساتھ لالٹین لے گیا تھا تاکہ تہہ خانہ اچھی طرح دیکھ سکے۔ مکان کے صحن میں اسے لوہے کا کڑا بھی نظر آیا۔ اُس نے دونوں ہاتوں سے کڑا تھام کر زور

لگایا تو پتھّر کی سِل اُٹھ گئی۔ اب اُس نے لالٹین کی روشنی میں تہہ خانے کے اندر جھانکا۔ وہاں سونے کی اشرفیوں کا ڈھیر لگا تھا۔ خوشی کے مارے اُس کی چیخ نکل گئی۔ لالٹین ایک طرف رکھی اور تہہ خانے میں اُترنے کی تیّاری کرنے لگا۔

ابھی اُس نے دایاں پاؤں ہی اندر رکھا تھا کہ ایک خوفناک آواز آئی۔ یہ وہی جِن تھا۔

"اچھا تو تم مجھے آزاد کرانے کے لیے آہی گئے۔ میں بہت دن سے اس تہہ خانے میں بند تھا۔ اے آدم زاد، تمہارا بہُت بہُت شکریہ۔ اِس احسان کے بدلے میں تم یہ سارا خزانہ بڑی خوشی سے لے سکتے ہو۔ مگر تمہیں میرا ایک کام کرنا ہوگا۔"

"ضرور، ضرور۔" ابراہیم نے کہا "میں ہر خدمت کے لیے حاضر ہوں۔ تم مجھے اپنا غلام سمجھو۔"

"بہت خوب" جِن نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "مجھے تُم جیسے ایک فرماں بردار غُلام ہی کی ضرورت تھی۔ اب ہم زندگی بھر ایک دوسرے سے الگ نہ ہوں گے۔ تم دیکھتے ہو کہ میری ٹانگیں کِس قدر کم زور ہیں، میں زیادہ چل پھر نہیں سکتا، اس لیے

مہربانی کر کے مُجھے اپنی پیٹھ پر سوار کرلو۔ اس کے بعد سارا خزانہ تمہارا ہے۔"

"آؤ، بڑے شوق سے آؤ اور میری پیٹھ پر سوار ہو جاؤ۔" ابراہیم نے سوچے سمجھے بغیر کہا۔ "تم جہاں کہو گئے، وہیں لے چلوں گا، اور جس جگہ حکم دو گے، وہیں اُتار دوں گا۔"

یہ سُنتے ہی جِن نے چھلانگ لگائی اور ابراہیم کے کندھوں پر سوار ہو گیا۔ اُس نے اپنی پتلی پتلی ٹانگیں ابراہیم کی گردن میں شکنجے کی طرح پھنسا لیں۔ جِن کے سوار ہوتے ہی پتھّر کی بھاری سِل خود بخود اُوپر اُٹھتی اور تہہ خانے کے مُنہ پر آن

گری۔ ابراہیم چلّایا۔ ’’مجھے خزانہ تو نکال لینے دو۔‘‘ لیکن جِن نے اُس کی ایک نہ سُنی اور زور سے اُس کی گردن دبائی۔ تکلیف سے ابراہیم کی آنکھیں اُبل پڑیں اور زبان مُنہ سے باہر لٹکنے لگی۔

’’ہا ہا ہا۔۔۔۔۔‘‘ جِن نے قہقہہ لگایا۔ ’’کیا عُمدہ سواری نصیب ہوئی ہے۔ چل میرے گھوڑے ذرا اپنی چال تو دکھا۔ چل، شاباش‘‘!

اور یوں مرتے دم تک ابراہیم اور جِن ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوئے۔